JANUARY
2025

جدید شعراء کا نمائندہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

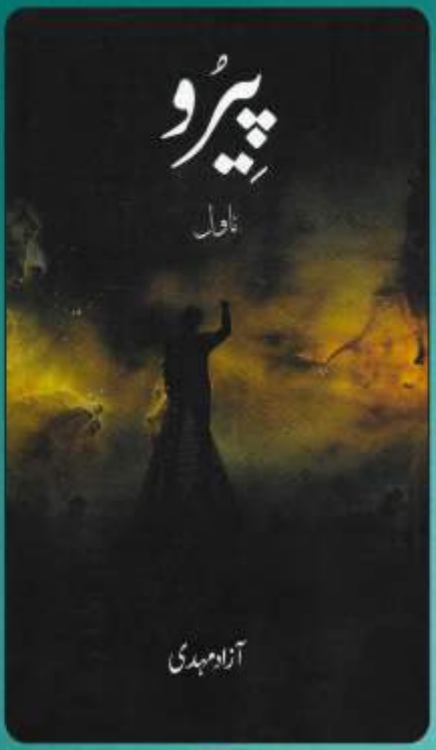
پیرُو
ناول
آزاد مہدی

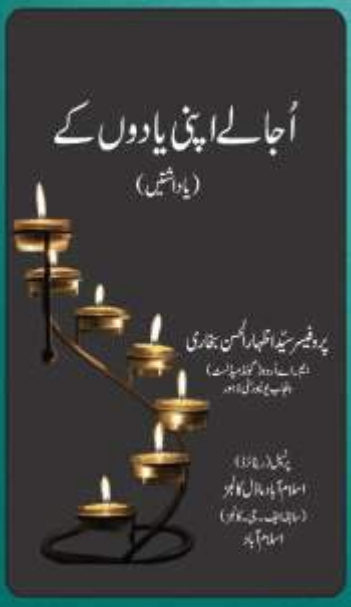
اُجالے اپنی یادوں کے
(یادداشتیں)
پروفیسر سیّد اظہار الحسن بخاری

صندل
جویریہ کاظم

غزل

یا تو ملال نہ کرنا یا اظہار ملال نہ کرنا
دیکھنا بازِ حسن میں خالد ایسی مجال نہ کرنا

وہ دروازے سے لوٹا دیں ، یہ عزت کیا کم ہے
درہمِ ہجر کے بدلے طلب دینارِ وصال نہ کرنا

جھلمل جھیل میں گھول نہ دینا ، یہ مٹی کی مٹھی
دیکھنا بابِ شوق میں شاملِ سطرِ ملال نہ کرنا

عشق میں تم دم دم تسبیحِ ذکر بڑھاتے جانا
لیکن ، دانہ دانہ حسابِ ماہ و سال نہ کرنا

شکر گزار عطا رہنا یہ عجز انہی کی عطا ہے
عجز میں رنگِ کمال بھریں تو غرورِ کمال نہ کرنا

اک اک بات تمہیں بتلا دی اب آگے تم جانو
وہ بھی جواب نہیں دیتے ہیں ، تم بھی سوال نہ کرنا

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 33 - جنوری 2025 - شمارہ نمبر: 1

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

جاہد احمد	کنور امتیاز احمد	نوید صادق	اعجاز رضوی	مجلس ادارت

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: سالِ نو مبارک

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
A/c Title: Monthly BAYYAZ
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے زیرک اینڈ ثانی پرنٹرز 16 کلومیٹر زرعی فارم نزد سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	سرور حسین نقشبندی، عزیز عادل، آفتاب خان	7 تا 9
2	نعت	جلیل عالی، نسیم سحر، سید ریاض حسین زیدی، خاور اعجاز محمد یٰسین قمر، شاہ محمد سبطین شاہ جہانی، فیض رسول فیضان نبیل احمد نبیل، سرور حسین نقشبندی، اعجاز دانش	10 تا 19
3	عقیدت	مرزا آصف رسول	20
4	رباعیات	محمد نصیر زندہ	21
5	ہائیکو	محمد علی ایاز	22
6	مضامین	جلیل عالی، خاور اعجاز، نثار ترابی، فرحت عباس شاہ خالد علیم، ظفر معین بلے جعفری، طاہر شبیر، شاہدہ دلاور شاہ عرفان جمیل، شجاعت علی راہی، صدام ساگر، اعجاز رضوی	23 تا 79
7	غزلیں	خالد احمد، آصف ثاقب، جلیل عالی، اعجاز کنور راجہ، خاور اعجاز نسیم سحر، محمد انیس انصاری، صفدر صدیق رضی، راحت سرحدی شاہ محمد سبطین شاہ جہانی، نثار ترابی، اقبال سروبہ، زاہد فخری خورشید ربانی، طالب انصاری، شوکت محمود شوکت، رضا اللہ حیدر شاہد اشرف، ذکی طارق، مسعود احمد، احمد جلیل، شاہین عباس	80 تا 178

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
7	غزلیں	رانا سعید دوشی، طاہر ناصر علی، افروز رضوی، اعجاز روشن، افتخار شوکت محمد نوید مرزا، طلعت شبیر، اوصاف شیخ، خالدہ انور، محمد سلیم ساگر اکرم سحر فارانی، نبیل احمد نبیل، عرفان صادق، ارشد محمود ارشد ریاض ندیم نیازی، راجہ عبدالقیوم، فیض رسول فیضان، احمد سجاد بابر محمد اشرف کمال، اعجاز دانش، علی رضا احمد، عقیل محسن، مظہر امام محمد افضال انجم، مرزا سکندر بیگ، ثمینہ سیّد، انصر حسن، آصف شفیع محمد اشفاق بیگ، علمدار حسین، ہمایوں پرویز شاہد، جسارت خیالی عزیز عادل، اکمل حنیف، اکرم جاذب، سرور فرحان، ظہور چوہان اصغر علی بلوچ، عاصم بخاری، محسن اسرار، ابن عظیم فاطمی، نائلہ راٹھور قمر نیاز، رمزی آثم، رانا خالد محمود قیصر، انصر منیر، ساگر حضور پوری زبیر خیالی، عابد رضا، فرح شاہد، حسنین نازش، جاوید عباس جاوید علی بن عزیز، نعمان محمود، اورنگزیب حسام حر، عامر معان، نوید عاجز ثقلین جعفری، جاوید ڈینی ایل، سرفراز عارض، کبیر انور جعفری مستحسن جامی، محمد آفتاب تابش، افضل ہزاروی، روا حاصل خلوص سید تیمور کاظمی، آصف محمود، حیا قریشی، غضنفر مہدی، امجد خان تجوانہ عبدالرؤف زین، ہنزلہ شاہد، محمد علی، آرب ہاشمی، نوید صادق	80 تا 178
8	افسانے	بلقیس ریاض، [کیتھرائن مینز فیلڈ / ترجمہ: فیروز بخت قاضی] درواشہ نوشین خان، نجم رضوی، ثمینہ سیّد، حنیف باوا	179 تا 208
9	مائکروفکشن	سید ماجد شاہ، مدثر حسین، عمار نعیمی، راجہ یوسف بابر امین ابر، ابومحمد انصاری	209 تا 214
10	نظمیں	خالد احمد، سید ریاض حسین زیدی، شاہنواز زیدی، منظور ثاقب رانا سعید دوشی، مسعود احمد، صغیر احمد صغیر، اجمل اعجاز، احمد جلیل عاطف جاوید عاطف، عزیز فیصل، محمد انیس انصاری، علی حسین عابدی امجد بابر، نائلہ راٹھور، آصف محمود، اسحاق وردگ، خالق آرزو شائستہ رمضان، بشریٰ شیریں، طلحہ غفور، اعجاز رضوی	215 تا 241

حمد

یہ جو برکتوں کا حصار ہے مرے چار سو
تری رحمتوں کی بہار ہے مرے چار سو

کئی رنگ ہیں تری شان کے مرے ہر طرف
کئی حیرتوں کا مدار ہے مرے چار سو

ترا اذن ہو تو میں جی اٹھوں رہ زیست میں
مری بے بسی کا مزار ہے مرے چار سو

یہ جو دھندلا پن ہے نگاہ کا یہ اجال دے
مری معصیت کا غبار ہے مرے چار سو

نہیں دسترس کسی بے کلی کی مرے تلک
ترا نام وجہِ قرار ہے مرے چار سو

مرے گرد و پیش ہیں خوشبوؤں میں بسے ہوئے
تری حمد جانِ بہار ہے مرے چار سو

مجھے سرور اس کا جمال کیسے دکھائی دے
مری اپنی ذات کا غار ہے مرے چار سو

سرور حسین نقشبندی

حمد

تزئینِ کائنات ہے تدبیر اُس کی حق
محتاج ہر بشر کی ہے تقدیر اُس کی حق

سمجھا رہا ہے شب پہ سیاہی وہ تان کر
صبحوں میں ہے دُھلی ہوئی تنویر اُس کی حق

اُس کا مقام و مرتبہ سب سے بلند ہے
جس دل پہ اُتری آیتِ تطہیر اُس کی حق

جب بھی اُسے پکارا وہی دستیاب ہے
در پر نہیں پڑی ہوئی زنجیر ، اُس کی حق

اِذنِ خدا سے روشنی پاتی ہے زندگی
ایمان کے چراغ ہیں جاگیر اُس کی حق

نارِ طلب میں راکھ ہوئے نامراد ہی
کوئی گھٹا سکا نہیں توقیر اُس کی حق

عزیز عادل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر سخن تھا ہم اہلِ غم کے لیے
دل شکن ، دل خراش ، دل آزار

حمد

گل و گلزار ترے، برق و شرر تیرے ہیں
ساری مخلوق، سبھی جن و بشر تیرے ہیں

موجِ طوفان میں ساحل کی طرف لاتا ہے
گنگناتے ہوئے دریا میں بھنور تیرے ہیں

شب کے گیسو بھی سنوارے ہیں تری قُدرت نے
اور اُجالے بھی دِکھے وقتِ سحر تیرے ہیں

سامنے تیرے اُٹھائے کوئی سَر کب ہے مجال
خادم و آقا سبھی زیرِ اثر تیرے ہیں

بخشنا کیا ہے کِسے تجھ کو خبر ہے ساری
سارے نابینا بھی اور اہلِ نظر تیرے ہیں

شِرک ہے جن کا وطیرہ انھیں بھی رزق دیا
خود کو تیرا نہ کہیں چاہے مگر تیرے ہیں

تیرے جلوؤں کے سوا کچھ بھی جہاں میں کب ہے
آفتاب اور ستارے بھی، قمر تیرے ہیں

آفتاب خان

نعتؐ

اے خدا میرے ہنر کا بھی شجر ہو بار ور
ہو عطا شایانِ شاں اک مدحتِ خیرالبشر

ایک لمحہ بھی قضا ہوتی نہیں ہے اس کی یاد
رات ہو، دن ہو، کوئی رُت ہو، سفر ہو یا حضر

دل میں ٹھہرا کر چلے تھے التجائیں چند ایک
کتنی لمبی ہو گئی اُس جا دعائے مختصر

آ گیا اک بار اُسؐ کے سایۂ رحمت میں جو
وار ہو کیسے کسی دشمن کا اُس پر کارگر

کیا کسی میدان پسپائی کا اٹھ پائے سوال
ہاتھ شاہِؐ بدر کا رہتا ہے اپنی پُشت پر

ڈال اپنے آپ پر بھی اک نگاہِ احتساب
کس کی امت سے ہے وابستہ ذرا احساس کر

اپنے کردار و عمل میں بھی سمو کچھ اُس کے عکس
خود پہ بھی عالی دکھا اُس خُلق کا کوئی اثر

جلیل عالی

نعتؐ

جو نعت حاصلِ مقصد کہا تو نعت ہوئی
اِسی کو مرکزِ ابجد کہا تو نعت ہوئی

نہ سابقہ کوئی اِس میں، نہ لاحقہ درکار!
لبوں سے لفظِ محمدؐ کہا تو نعت ہوئی

بس ایک حرف بڑھایا جو حمد میں مَیں نے
اِسے بدل کے جو احمدؐ کہا تو نعت ہوئی

جو صِدقِ دِل سے کہا اُن کو مُرشِدِ کامل
اور اپنے آپ کو مُرشَد کہا تو نعت ہوئی

جو لاشعور کو میں نے گرفت میں لا کر
اِسے شعور کی آمد کہا تو نعت ہوئی

خدائے پاک کی وحدانیت کا وِرد کیا
سو جب بھی زور سے اشہد کہا تو نعت ہوئی

نظر نواز ہوا جونہی گنبدِ اخضر
اور اِس کو نُور کا گنبد کہا تو نعت ہوئی

فضائے ارضِ مدینہ کے رنگ و بُو کو نسیم
وَرائے اَبیَض و اَسوَد کہا تو نعت ہوئی

نسیمِ سحر

نعتؐ

ہے ضروری کہ ہو خدا سے بات
یعنی محبوبؐ کبریا سے بات

بے خیالی میں لطف دیتی ہے
آپؐ کے شہر کی ہوا سے بات

ہے جو مہکی ہوئی درودوں سے
کاش! ہو جائے اس فضا سے بات

رب نے ہر چیز آپؐ کو دی ہے
پوچھ کر آپؐ کی رضا سے بات

اوج انسانیت پہ فائز ہے
شاہؐ کونین کی خدا سے بات

میں بھی رہتا ہوں گوش بر آواز
ہو کبھی مجھ سے بے نوا سے بات

جس سے روشن ہوئے ہیں قلب و جگر
روح کرتی ہے اس ضیا سے بات

عافیت کے لیے ضروری ہے
سر پہ رحمت بھری ردا سے بات

خواہشیں مستجاب ہو جائیں
دھڑکنوں کی ہے التجا سے بات

میری لغزش کی ایک بخشش ہے
انؐ کی رحمت کی انتہا سے بات

اب شفاعت ریاض کی بھی ہو
میری ہے آپؐ کی دعا سے بات

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

خدا کی سمت مسافت میں جو قریب کا ہے
وہ راستہ تو فقط اُس کے ہی حبیبؐ کا ہے

بفیضِ نعت اضافہ ہُوا مراتب میں
عیاں ہے رُتبہ وگرنہ جو مجھ غریب کا ہے

ثنائے خواجہؐ مرے بس کی بات کب تھی بھلا
کرم یہ مجھ پہ مرے راقمِ نصیب کا ہے

چمن کے سارے ہی پھولوں سے واسطہ ہے مگر
گلِ حرا سے مرا رشتہ عندلیب کا ہے

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تو نے ہر ذرّے کو سورج سے ہم آہنگ کیا
تو نے ہر قطرے میں اِک بحر کی وسعت لکھی

نعتؐ

میری اس ڈولتی ناؤ کو کنارہ مل جائے
زیست کے بحر میں گر اُنؐ کا سہارا مل جائے

میں کہ صدیوں کی مسافت پہ کھڑا ہوں اے دل!
چند لمحے ہی سہی اُنؐ کا نظارا مل جائے

جن کو ہر آن حضوری کا شرف حاصل ہے
کاش ان لوگوں سے میرا بھی ستارا مل جائے

جن کے الفاظ دمکتے ہیں ستاروں کی طرح
ایسے خوش بختوں سے اُسلوب ہمارا مل جائے

اُنؐ کی دہلیز ہو اور بھیگتی پلکیں میری
اُنؐ کی درگاہ میں کچھ عرض کا یارا مل جائے

جس کو لیجائے مواجہ پہ مقدر یٰسین
اس کو دنیا ہی میں بخشش کا اشارہ مل جائے

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

یہ بندۂ ناچیز ہے اور شاہ عطا ہے
بے رنگ سے صد رنگ میرا قلب ہوا ہے

انوار کی برسات ہے دل جھوم رہا ہے
یہ عرش کا منظر ہے کہ طیبہ کی فضا ہے

حاجب نہ ہوں کیوں چاند ستاروں کے مناظر
اس در سے ضیا لینے کو خورشید کھڑا ہے

محدود نہیں شمسِ سخاوت کی شعائیں
کونین میں ہر سمت ترا نورِ سخا ہے

اس عزت و توقیر کے لائق تو نہیں تھا
اے شاہ عطا آپؐ کی یہ خاص عطا ہے

ہے عرش ترے ذکر کی خوشبو سے معطر
جنت کے گلابوں پہ ترا نام لکھا ہے

کتنی ہے حسیں آپ کے ارشاد کی مسند
الفاظ کے برجوں میں ستاروں کی ضیا ہے

سورج سے فزوں تر نہ ہو کیوں کر تیرا حبشی
ہر ذرّہ تیرے شہر کا خورشید نُما ہے

بوبکر کو صدیق کیا ترے کرم نے
عثماں کو غنی تیری عنایت نے کیا ہے

سبطینؓ کے صدقے میں کرم نازِ مسیحاؑ
سبطین بہت دیر سے بیمار پڑا ہے

اے قاسمِ دینارِ کرم ، لطف فراواں
سبطین تری آل کا اِک ادنی گدا ہے

شاہ محمد سبطین شاہ جہانی

نعتؐ

مصطفیٰ لامکاں میں بلائے گئے
بے حساب اُن کے درجے بڑھائے گئے

بات ہی حق نے ''سبحان'' سے کی شروع
اعتراضات جڑ سے مٹائے گئے

مسجد اقصیٰ میں تھے سب نبیؑ مقتدی
اور امام اُن کے آقا بنائے گئے

رہ گئے سدرہ پر جبرئیلِؑ امیں
آپ اکیلے ہی اوپر لے جائے گئے

''اُدنُ مِنّی'' کی آواز آنے لگی
حد سے بڑھ کر وہ نزدیک لائے گئے

''قاب قوسین'' کا میکدہ کُھل گیا
وصل کے جام بھر بھر پلائے گئے

سر کی آنکھوں سے دیکھا خدا آپ نے
سب حجابات یکسر اُٹھائے گئے

یار سے کچھ بھی حق نے چھپایا نہیں
سب مقامات اُن کو دِکھائے گئے

مرحبا! رات فیضان معراج کی
جس میں سب اُمتی بخشوائے گئے

فیض رسول فیضان

نعتؐ

مقامِ خیر ہے آہستہ چل مدینے میں
کِھلے ہیں خیر کے کیا کیا کنول مدینے میں

نبیؐ کے شہر میں حاجت روائی تیری ہے
قدم قدم پہ ہے مشکل کا حل مدینے میں

نہ جا سکے گا مدینے ہوس پرست کوئی
نہ رہ سکے گا کوئی بے عمل مدینے میں

ہر اِک گلی ہے کہ جیسے بہشت ہو کوئی
ملا ہے خُلد کا نعم البدل مدینے میں

ہزار برسوں سے صدیوں سے لاکھ بہتر ہے
کٹے جو زیست کا کوئی بھی پَل مدینے میں

مرے خدا کو یہ میری ادا پسند آئی
رواں دواں میں رہا سر کے بَل مدینے میں

خُدا کرے میں وہیں دفن ہو کے رہ جاؤں
خُدا کرے مجھے آئے اَجَل مدینے میں

یہ فیض ہے تو فقط فیض ہے مدینے کا
کہ دُور ہوتے ہیں سارے خلل مدینے میں

مرا وُجود تو جیسے نبیل کِھل اُٹھا
تمام نیک کیے ہیں عمل مدینے میں

نبیل احمد نبیل

نعتؐ

ہر نیا سال جب بھی آتا ہے
نعت کا زمزمہ سناتا ہے

عیسوی سال ہو کہ ہجری ہو
ان کے قدموں سے فیض پاتا ہے

اسمِ احمد میں ہے مٹھاس اتنی
نطق میں شہد گھلتا جاتا ہے

ہر زمانہ مرے نبی کا ہے
ہم کو قرآں یہی بتاتا ہے

ذکر ان کا مرے تخیل کو
نت نئی روشنی دکھاتا ہے

آنکھ کے روزنوں میں شام و سحر
سبز گنبد ہی جھلملاتا ہے

لوٹ کر ان کے شہر سے آنا
تشنگی اور بھی بڑھاتا ہے

خیر ہی بانٹیے زمانے میں
ان کا اسوہ یہی سکھاتا ہے

ہر نیا سال شکر ہے سرور
حاضری کا پیام لاتا ہے

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

جس طرح بیت حرم کو مرا سجدہ چومے
یوں تصور میں حرم آپ کا روضہ چومے

ہے تخیل سے ورا تیرا عروج اور کمال
جھوم کر عرش معلیٰ ترا تلوا چومے

ایک پیالے سے جو ہوں سیر صحابہ ستر
کیوں نہ ہر روح تصور میں وہ پیالہ چومے

تیری گلیوں میں پھریں بن کے گدا شاہ زماں
کاش قسمت سے در شاہ کا صدقہ چومے

سعدیہ گھر پہ تیرے عرش سے اتری رحمت
ہر فرشتہ تری دہلیز کا ماتھا چومے

نقش پا چوم کے خوشبوئیں پھریں اتراتی
صبح دم آئیں بہاریں تیرا رستہ چومے

اقتدا میں ہیں کھڑے سارے نبی سارے رسول
اور مصلے کو تیرے مسجد اقصیٰ چومے

آج ہر اہل قلم کو یہ بتا اے دانش
پیشتر نعت کے لکھنے سے ارادہ چومے

اعجاز دانش

عقیدت

حریمِ صلِّ وَسلِّم علیٰ محمدؐ سے
قرار و وجد ہے طیبہ سے سبز گنبد سے

حضور اگر نہ دکھاتے غلوِ زیست ہمیں
پڑے ہی رہ گئے ہوتے زمیں پہ ہم رد سے

کتاب و علم و خبر، دین و اعتقاد و نظر
بچایا سب کو پیمبرؐ نے وقت کی زد سے

خُلق انھی کا ہے فرقانِ زندگی ورنہ
نہادِ نیک جدا تھی کہاں خوئے بد سے

ہم ایسے حرف تھے جن کی صدا نہ تھی کوئی
ہمیں کلام بنایا نبی نے ابجد سے

ہے کھولا رازِ عبادت نبی نے عابد پر
ہے رشتہ عبد کا معبود سے؟ کہ معبد سے؟

نہ کہتے سب سے اگر کُلُّکُم لِآدم آپؐ
عرب عجم سے نہ ملتے نہ ابیض اسود سے

ہے نور تو وہ جسے چشمِ کور بھی دیکھے
وگرنہ ملتا ہے کیا خاص؟ بدر و عسجد سے

وہ نور نورِ محمدؐ ہے ہر کسی کے لیے
مگر اُٹھا لیا جاتا ہے قلبِ مرتد سے

حضور! آج یہ انساں ہے پھر ملولِ جہاں
بچایئے بشریت کو دیو سے دد سے

یہ کون جانے؟ ہے کیا؟ وسعت مدینہ علم
کہ ہم ہیں اپنے حصاروں میں ہی مُقیّد سے

حضور! چھین نہ لے یہ جہاں وہ دولتِ حق
ملی جو آپ کے صدقے ہمیں اب و جد سے

حضور! چھوڑ دیں ہم نے سُنَن اور اپنے لیے
ضوابط اور ہی کچھ کر لیے مُؤکّد سے

دکھا کے خلق کو اِلّا لِیَعبُدُون کی ضو
بہم نبی نے کیا سب کو ان کے مقصد سے

نہ سیکھتی اگر آداب مصطفیٰؐ سے یہ زیست
حیات اتر گئی ہوتی شرف کی مسند سے

درونِ اَحسنِ تقویم جاتی کب وہ نظر
جو تولے حُسن کو صرف ان کے خال سے خد سے

تو وارے ان پر اگر جان بھی تو کم ہے ابھی
بڑھایا جس نے تجھے اے بشر! ترے قد سے

دل و نظر کو ہے درکار ضو محمدؐ کی
تراشے عقل بھلے جو بھی علم کے عد سے

براقِ عشقِ پیمبرؐ کا ہے ہر ایک افق
فقط خرد کہاں نکلی ہے اپنی سرحد سے

ہے وہ حمید کہ محمود اس کی حمدِ ازل
ہے جلوہ ریز ابد تک محمدؐ احمدؐ سے

دل و نظر کے لیے رُشدِ اِنَّ اَصحابِی
ہے گا لنُّجُوم محمدؐ کے فیضِ سرمد سے

متاعِ صلِّ علیٰ کا امیں ہوں میں آصف!
اب اس سے بڑھ کے میں کیا اور مانگوں ایزد سے

مرزا آصف رسول

رباعیات

سورج پہ اندھیرے کا عذاب آتا نہیں
شعلہ سائے کے ہم رکاب آتا نہیں
اس شہر کے بے ضمیر ہیں اہلِ قلم
ایسی مٹی پہ انقلاب آتا نہیں

شب تاب ہے زخم زخم تنویر بھی دیکھ
ہر پھول کو خوں گشتہء تحریر بھی دیکھ
تقریر مرے دستِ بریدہ کی سن
خاموش نہیں حلقہء زنجیر بھی دیکھ

غم جیت لیے درد بھی ہارے نہ گئے
دیوانے ترے موت سے مارے نہ گئے
اے قدس تری گلیوں کے آوارہ خواب
تعبیر کے محشر میں پکارے نہ گئے

مقتول نگاہ ء آئنہ جو کی قسم
بالینِ قبر زلفِ شب خو کی قسم
پہنائیں گے تجھے نئی صبح کے رنگ
اے ارضِ مقدس تری خوشبو کی قسم

رو پوش ہوئے گوشہء دستار میں خواب
یعنی سو گئے سوچ کی تلوار میں خواب
آئینہ ء تعبیر کہاں سے دیکھیں
ہم رکھتے نہیں دیدہء بیدار میں خواب

تقریر عجب زیرِ کفن کرتے ہیں
سرکٹ کے بھی رقصِ سخن کرتے ہیں
جب ارضِ وطن پہ رات کا پہرہ ہو
ہم حرف کو سورج کی کرن کرتے ہیں

اے موت ترے غم کی عبادت کرے کون
پیشِ دار و رسن بغاوت کرے کون
دستور یہاں ہے ظلم کا پہرے دار
زنجیرِ عدل کی وکالت کرے کون

خوشبو کو دلھن کا پیرہن دیتے ہیں
احساس کو پھول کا بدن دیتے ہیں
گلشن میں ہمارے خواب جو قتل ہوئے
لالے کو نیا رنگِ سخن دیتے ہیں

محمد نصیر زندہ

ہائیکوز

سبز سبز پیڑوں پر
لخت لخت شاخیں اور
زرد زرد پتے ہیں

خوف کے مکانوں میں
آدمی تو رہتے ہیں
زندگی نہیں رہتی

آنسوؤں کی بارش میں
جب کوئی نہاتا ہے
کھل کے مسکراتا ہے

تخلیے کے بستر پر
عمر بھر کوئی کیسے
کروٹیں بدلتا ہے

آسماں کی وسعت میں
گمشدہ ستارے سے
گفتگو نہیں ہوتی

ہجر کی حویلی میں
وصل جب اترتا ہے
سرخ پھول کھلتے ہیں

زندگی کی بانہوں میں
خوشگوار لمحوں کو
سب تلاش کرتے ہیں

موت کی ہتھیلی پر
زندگی کی مہندی ہے
یہ عجب پہیلی ہے

تیرگی کا دعویٰ ہے
روشنی کا دامن بھی
روشنی سے خالی ہے

محمد علی ایاز

حیاتِ نوید کا ایک حیرتی ''دورانیہ''

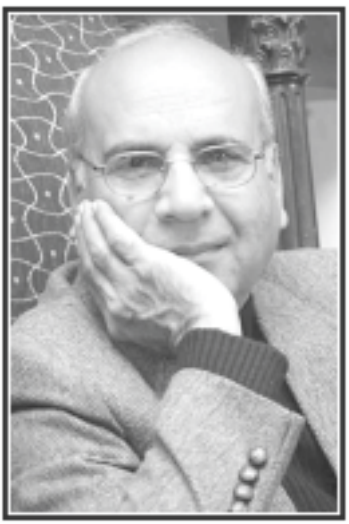

نوید صادق کلاسیکی معنوں میں صاحبِ طرز شاعر ہو نہ ہو مگر بڑے وثوق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ خاص اپنے طریقے سے نظم کہتا ہے۔ اس کے اس طریقے کے اور خواص بھی ہوں گے مگر ایک پہچان یہ ہے کہ وہ ادھورے مصرعوں کو ابلاغِ مسلسل سے نوازتا، اعزازتا اور اعجازتا ہوا نظم کو آگے بڑھاتا ہے۔ مفہوم و معنی کے اعتبار سے اس کی حیاتِ مستعار کا یہ دورانیہ ڈھلے ڈھلائے خیالات کے بجائے ایک بے نہایت 'ڈھونڈ' کے کرب و اضطراب کا سراغ دیتا ہے۔ اس ڈھونڈ سے ایسے ایسے سوالات سر اٹھاتے ہیں جو کہیں کہیں قاری کے پختہ ایقانوں کی فصیلوں میں بھی دراڑیں ڈال دیتے ہیں۔ یہ ایسا زرخیز تجسس ہے جو بیسیوں بنجر یقینوں سے زیادہ ثروت مند ہے۔ اس کی ہر نظم ایک بے ساختگی کے ساتھ اس کے سانسوں کی آمد و شد کے آہنگ پر اپنا سفر مکمل کرتی ہے۔ تاہم قاری کو اپنا ہم قدم رکھنے کے لیے اسے بار بار سانس روکنا پڑتی ہے۔ جو

جلیل عالی

شاعر اپنی روحانی اپج اور وجودی گہرائی سے دوسروں کے دکھ سکھ جینے اور دوسروں کو اپنا ہمراز بنانے کا مکلف ہو اس کی شاعری چیستانی جہنم نہیں بنتی۔ یہی وجہ ہے کہ نوید صادق کی نظموں میں سانس لیتی سرگوشیاں ورق در ورق اپنی نرولتا اور سچائی کی بنا پر قاری کو یکسو ہو کر کان لگائے رکھنے پر مجبور کرتی ہیں۔

''دورانیہ'' کی چند نظموں کے مختصر اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

کون کہاں کا سچا ہے
اس بے ہنگم افسانے میں
کس نے کتنی چوری کی
کس نے کتنے رنگ بھرے
میں کیا جانوں؟
جانتا بھی تو ------
مجھ سے پوچھنے کا کیا مطلب
میں کوئی ------!
مجھ سے!
تیرا مطلب کیا ہے؟

کس دنیا کی باتیں ہیں یہ؟
کن لوگوں کو روتے ہو!
جانے بھی دو
میرا رستہ -------!
اور بھی کوئی رہتا ہے کیا؟
کس کا رستہ دیکھ رہے ہو؟
میں کیوں پوچھوں
(یوم الحساب)

.....

ان دنوں کوئی لحظہ
(دھیان سنگھ بینے سے بھی یاد کے کینوس پر ابھرتا نہیں)
مرا چور تھا
میری آنکھوں پہ پردہ تھا
اور ذہن میں کچھ نہیں تھا
مگر!
یاد کے دیپ جل اُٹھنے سے پیشتر
میرے بائیں طرف
شہر کے مرکزی چوک سے
ایک آواز اٹھا
ادھر دیکھنا ------!
شام گہری نہیں، پھر بھی تاریکیاں
میں نے پتھر کے ادوار دیکھے نہیں
پھر بھی سن رکھا ہے ------!
ایسی تاریکیاں!
آج تقدیر سے میرے سر پر مسلط ہوئی ہیں

کہ پتھر کا انسان بھی دیکھ لے تو کہے
------اب بھی کہنے کو باقی ہے کچھ تو کہو!

(ایک بے بس نظم)

.....

کوئی فٹ پاتھ پر
کب تلک سگرٹوں کے سہارے جیے
دھیان میں کوندتی بجلیاں راکھ کرنے لگیں
اور میں شہر کا شاید اک آخری فرد ہوں
کچھ نہیں کھل رہا
بند کھڑکی کھلے تو میں آگے بڑھوں

(میرا ذمہ نہیں)

.....

----اپنی تنہائی میں
اپنی پہنائی میں
دن کیے جا رہے ہیں
بس جیے جا رہے ہیں

کوئی پوچھے تو ہم کچھ نہیں بولتے
ہم نے کچھ کھو دیا ہے کہیں
کھو دیا ہے مگر
ٹھیک سے یاد پڑتا نہیں
کون تھا وہ؟
کیا ہوا؟
کس نگر میں اقامت گزیں ہو گیا
کس کہانی کے الجھاؤ میں رہ گیا

(یہ مرا شہر تھا)

.....

آنے دو جو آتا ہے
وقت کے چابک سہ سہ کر
خود رستے پر آ جائے گا
ایسے کتنے رنگ فسانے
دریا اپنے ساتھ بہائے پھرتے ہیں

اپنی اپنی مرضی ہے
کوئی ساتھ نبھاتا ہے
کوئی چھوڑ کے چل دیتا ہے
کس کس پر الزام تراشیں
کون درختوں سے الجھے گا
چپ بھی ہوں تو چپ مت جانو
خود سے باتیں کرتا ہوں
پیروں بولتا رہتا ہوں
کہتا ہوں اور سنتا ہوں
تم کیا جانو؟

(میرا کیا ہے)

☆☆☆☆☆

ولی دکنی بمقالہ سراج اورنگ آبادی

سیّد میاں محمد ولی اللہ ولی دکنی کو یہ اوّلیت حاصل ہے کہ اُنھوں نے مروّجہ پیچیدہ استعارات اور دُور از کار تشبیہوں سے اُردو غزل کو پاک کیا۔ ہندی الفاظ کے ساتھ ساتھ فارسی الفاظ اور مضامین کو اُردو میں متعارف کرایا اور شمالی ہند کے شعرا کے لیے ایک نمونہ بنا دیا نتیجتاً ولی کے کلام کو بے حد پذیرائی حاصل ہُوئی جس کی تقلید ایک عرصہ تک ہوتی رہی اور اُن کے کلام کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

ولی قدیم ادب کی روایت کے زِندہ عناصر کو تصرف میں لا کر فکر و اِظہار کی نئی سطح سے مِلاتے ہیں اور اُردو زبان و ادب کو فارسی طرزِ احساس میں ڈھال کر معاشرے کی اِس خواہش کو پُورا کرتے ہیں جو ایک طرف فارسی زبان کو چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا اور دُوسری طرف خُود فارسی زبان میں تخلیق کرنا اُس کے لیے دُشوار ہو گیا تھا۔ ولی کی ذات سے اُس شاعری نے جنم لیا جس نے ہندی بحروں اور تراکیب و خیالات کی جگہ فارسی ماحول سے یہی کچھ حاصل کیا۔ وہ غزل میں ایک خاص معنویت اور طرزِ احساس کے بانی ہیں۔ اُن کی غزل سے جذب و نشاط کی ایک شگفتہ قوس قزح اُبھرتی ہے۔ البتہ فکری عناصر نیز کائنات کی دیگر سچائیوں کے بارے میں اُن کا رویّہ یا ردِّعمل نہ ہونے کے برابر ہے۔ مظاہرِ قدرت پر غور کرنے کے بجائے اُنھوں نے اِن مظاہر سے لُطف اندوزی کو ترجیح دی ہے۔ وہ بصیرت سے زیادہ بصارت کے ترجمان ہیں۔ قلبی گہرائی اگر کہیں مِلتی بھی ہے تو وہ اُتھلی سی ہے۔ لگتا ہے وہ یا تو کبھی غم آشنا نہیں ہُوئے یا اُن کے مرحلۂ عشق میں منزلِ درد ہی نہیں آئی۔ ولی کے ہاں تکرارِ مضامین تو ہے لیکن اُن کے لطیف پیرایۂ اِظہار نے طبعِ سلیم پر گراں نہیں گذرنے

خاور اعجاز

دیا اور شیریں الفاظ اور موسیقیت کی حامل تراکیب کے جلو میں کا روانِ فن سبک خرامی سے منزلِ اظہار طے کر گیا جو از خود ایک بہت بڑی فنی خوبی ہے۔

ولی اپنی طرز کے پہلے شاعر ہیں جن کے اسالیب نے قبولیتِ عام حاصل کی۔ وہ پہلے شاعر ہیں جن کی خوشبو نے پورے چمنِ اُردو کو مہکا دیا اور اپنے زمانے کے تمام لسانی پیرَ توڑ دیے۔ ولی کی اُردو غزل اُس زمانے کی فارسی غزل سے موضوعات کے لحاظ سے مختلف ہوتی نظر آتی ہے۔ وہ خسرو اور قلی کے بعد اُردو غزل کا تیسرا بڑا ستون ہیں لیکن اِن دونوں سے بھی بڑے ہیں۔ اُن کا کمال یہ ہے کہ اُردو زبان علاقائیت کے چنگل سے نکل کر پورے ملک کی پہچان بنتی گئی۔ اُن کی غزل میں انفرادیت بھی ہے، غزل کے نئے اِمکانات بھی ، نئے موضوعات بھی اور زبان و بیان کے نئے پیرائے بھی۔ اُردو غزل میں تغزل کی روایت ولی سے مضبوط ہوتی دکھائی دیتی ہے اِس لیے کہ اُنھوں نے گزشتہ کی خارجیت کے مقابل اپنے اندرون میں جھانکنے کو ترجیح دی اور اِس درون بینی میں بھی وہ نشاطیہ لمحات اور جمال انگیز وقتوں سے زیادہ قُربت کا اِظہار کرتے ہیں۔ محبوب کے سراپا کی تفاصیل اُن کا مرغوب موضوع رہا۔ وہ اپنے عہد تک کی غزلیہ روایت میں قطب نما کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کی غزل غنائیت سے معمور، زمینوں کے چناؤ میں معنی خیز، الفاظ کے برتاؤ میں برجستہ اور زبان میں وسعت انگیز ہے۔ ترکیب سازی کے ہنر میں بھی وہ پہلوں سے بہت آگے دکھائی دیتے ہیں۔

وہ ایک پختہ کار اور قادر الکلام غزل گو تھے۔ اُنھوں نے اُردو زبان اور اُردو غزل دونوں کے رواج میں اپنے سے پہلوں کے مقابلے میں بہت زیادہ کردار ادا کیا اور اُس زبان کو مقامی رنگوں سے نکال کر ایک ایسا لطیف پیرایہ عطا کیا جو ہندوی، گجری، دہلوی یا دکنی وغیرہ کی قیود سے آزاد ہو کر ایک مرکزی زبان یعنی اُردو کے فروغ میں بے حد مفید ثابت ہُوا اور شعرا کا رجحان نظم سے زیادہ غزل کی طرف ہو گیا۔ دُوسرے یہ کہ اُنھوں نے فارسی اور ہندی کے عناصر کو کامیابی سے برتا اور اُردو میں وہ سب کچھ مہیّا کر دیا جو اس سے پہلے صرف فارسی غزل میں دکھائی دیتا تھا۔ پھر یہ کہ آدھی فارسی آدھی ہندی روایت کو بھی عام فہم اُردو میں بدل دیا اور شعرا اپنے اُردو دیوان مرتب کرنے لگے۔ اُنھوں نے اپنے زمانے کے عمومی چلن کے برعکس محبوب کے لیے صیغۂ مونث استعمال کیا۔ ولی کی تقلید زبان و بیان کے علاوہ اُن کی اِختیار کردہ زمینوں

میں بھی ہُوئی مثلاً کام/ نام تجھ لب کا (آبرو)، ناشاد/بیداد ہے (حاتم)، کاری / بھاری لگے، (فائز)، ہمسر / اخگر آفتاب (میر)۔

تصوف اُس زمانے کا دلپسند موضوع تھا۔ اِس لیے بھی کہ اُسے فکری اور اخلاقی بلندی کا معیار سمجھا جاتا تھا جب کہ دُوسری طرف اُس میں ایک رومان انگیز تشفی کا سامان بھی موجود تھا۔ کچھ ایسے شعرا کو چھوڑ کر جنھیں واقعی تصوف سے لگاؤ تھا، دُوسروں نے تصوف کے مضامین کو یا تو فیشن کے طور پر اِستعمال کیا یا پھر تصوف والے عشق کے نام پر بازاری عشق کا بازار گرم کیے رکھا۔ تصوف کی طرف ذہنی جھکاؤ کے سبب ولی نے بھی مضامینِ تصوف کو اپنی شاعری میں باندھا اور پہلوں سے اچھا باندھا تاہم اُن کی بیشتر غزلیہ شاعری کی بنیاد بازاری عشق نہ سہی لیکن وہی روایتی عشق ٹھہرتا ہے جس پر ہماری اُردو غزل کی عمارت کھڑی ہے۔ وہ خُود بھی شاعری کو 'خوش طلعتاں' کے ذکر سے منسوب کرتے ہیں۔

ولی محبوب کی سراپا نگاری میں خاص کمال رکھتے تھے جو لکھنوی شعرا کی طرح حُسن کو محض خارج میں نہیں دیکھتے بل کہ اپنی ذات، اپنی شخصیت، اپنے جذبے اور اپنی داخلی اِنفرادیت کا حصّہ بنا کر ایک اثر انگیز عنصر میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ولی کو وہ مقام عطا کرنے میں، جس پر وہ آج متمکن ہیں دو واقعات کا بڑا دخل ہے - ایک تو اورنگزیب کی فتح دکن جس نے دکن کو دلّی سے مِلا دیا اور دُوسرے اِس کے نتیجے میں ولی کی دِلّی میں سعد الدین شاہ گلشن سے مُلاقات جس کے سبب ولی کی غزل فارسی روایت کے قریب ہُوئی اور بعد میں ولی کی روایت کے طور پر پہنچائی گئی۔ گویا ولی کے چُھونے سے غزل اپنے بچپن سے نِکل کر نوجوانی کی حدود میں داخل ہُوئی اور اپنی روایت میں پہلے بڑے تغیر اور پہلی کروٹ سے آشنا ہُوئی۔ ولی نے اُردو غزل کو ایک نئے رجحان سے متعارف کرایا، اِس کی تراش خراش کر کے اِس کو بحور کا ایسا لباس تلاش کر کے پہنایا اور اِس کے مُنہ سے ایسے الفاظ کہلوائے کہ غزل کو خُود پر رشک آنے لگا۔ زبان کی ساخت اور اپنے عہد کے معیاروں کی اشاعت کے لحاظ سے ولی ایک بُلند درجہ رکھتے ہیں۔ اُن کے ہاں کہیں کہیں ایسا شعر بھی نِکل آتا ہے جس پر زمانہ حال کا گمان ہوتا ہے۔

ولی کا قابلِ ذکر اِضافہ یہ ہے کہ اُنھوں نے غزل کی توجہ محبوب مجازی کے تن بدن سے ہٹا کر زِندگی کے دُوسرے خارجی معاملات و مسائل کی طرف بھی لگائی اور اُسے بازاری پن اور اُتھلے جذبوں سے نِکال کر شائستگی، سنجیدگی اور گہرائی عطا کی۔ ولی نہ ہوتے تو

شاید غزل محبوب کے سراپا کے گرد گھوم گھوم کر بے حال ہو جاتی - ولی ہی کی بدولت اُن کے معاصرین اور بعد میں آنے والوں نے رُومانی موضوعات کے علاوہ دُوسرے خیالات اور تجربات کو بھی غزل کا حصّہ بنایا- ولی کے دریائے شاعری سے نکلنے والے رجحانات نے آبی گذرگاہوں کی طرح مختلف سمتوں میں نکل کر سرزمین غزل کی سیرابی کی - ہندی اثرات کے برعکس فارسی اشعار اور محاورات کے تراجم کو اپنی زبان میں بیان کرنے کی روایت کا آغاز بھی ولی سے ہی ہوتا ہے- ولی کی غزل شگفتگی سے لبریز ہے، غم واندوہ، یاس و حرماں اور فلسفہ و فکر کے عناصر جو ہمیں بعد کی غزل میں ملتے ہیں، ولی کے ہاں نہ ہونے کے برابر ہیں- اُنھوں نے زندگی کو حکیمانہ نظر سے نہیں بل کہ طائرانہ نظر سے دیکھا ہے- اُن کے پاس خیال ہے، جسم اور رُوح کی تلاش میں سرگرداں خیال- وہ حقیقت سے زیادہ تصور کے سہارے اور باطن میں غوطہ زن ہُوئے بغیر ظاہری سراپے کی شاعری کرتے نظر آتے ہیں- منطقی صداقت کے بجائے شعری صداقت ولی کا خاص رجحان ہے- وہ اُردو غزل کے ایک منفرد اجتہادی شاعر ہیں جنھوں نے اپنے اضافوں سے اُردو غزل کو نکھارا- ولی کے ہاں غزل پہلی بار احساس سے مَس ہو کر اُبھری ہُوئی صنفِ سخن کے طور پر متعارف ہُوئی - اِس بات کے شواہد ہوں یا نہ ہوں کہ ولی نے شمالی اور جنوبی ہند میں لسانی وحدت کی کوئی شعوری اور عملی کوشش کی یا نہیں لیکن اُن کے طرزِ بیان نے اِس عمل کو مہمیز ضرور لگائی اور اِس کی ایک مثال اُن کا فارسی کے ساتھ ہندی اور مقامی الفاظ کا اِستعمال ہے جس سے ایک ہمہ گیریت پیدا ہُوئی اور مختلف علاقوں میں اُن کی زبان سمجھی اور پہچانی جانے لگی اور ایک نئی جہت کا آغاز ہُوا جس کی طرف بعد کے شعرا نے بھی سفر کیا- اِس نئی جہت میں زبان کی سلاست، ترنم اور شگفتگی کو زیادہ مدِ نظر رکھا گیا- ولی اپنے دور کا تخلیقی اعتماد ہیں- بے شک ولی غزل کا ایک معیار ٹھہرتے ہیں-

وو صنم جب سوں بسا دیدۂ حیران میں آ
آتشِ عشق پڑی عقل کے سامان میں آ

از بس کہ زندگی میں یُوں محو ہُوں ولی مَیں
مشکل ہُوا اجل کوں کرنا سراغ میرا

دیکھنا ہر صبح تجھ رُخسار کا
ہے مطالعہ مطلعِ انوار کا

مسندِ گُل منزلِ شبنم ہُوئی
دیکھ رُتبہ دیدۂ بیدار کا

جب سوں وہ نازنیں کی مَیں دیکھا ہُوں چھب عجب
دِل میں مرے خیال ہیں تب سوں عجب عجب

.....

ولی جنّت میں رہنا نہیں درکار عاشق کوں
جو طالب لامکاں کا ہے اُسے مسکن سوں کیا مطلب

.....

بے حقیقت گرم جوشی دِل میں نہیں کرتی اثر
شمع روشن کیوں کے ہووے شعلۂ تصویر سوں

.....

اے دِل شتاب چل کہ تماشے کی بات ہے
بیٹھا ہے آفتاب نِکل ماہتاب میں

.....

کم نگاہی سوں دیکھتے ہیں ولے
کام اپنا تمام کرتے ہیں

.....

سجن کے باج عالم میں دِگر نہیں
ہمن میں ہے ولے ہم کو خبر نہیں

.....

کیا مجھ عشق نے ظالم کوں آب آہستہ آہستہ
کہ آتش گُل کو کرتی ہے گلاب آہستہ آہستہ

عجب کچھ لُطف رکھتا ہے شبِ خلوت میں گُل رُو سوں
خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

ادا و ناز سوں آتا ہے وہ روشن جبیں گھر سوں
کہ جیوں مشرق سوں نِکلے آفتاب آہستہ آہستہ

ولی مجھ دِل میں آتا ہے خیالِ یارِ بے پروا
کہ جیوں انکھیاں منیں آتا ہے خواب آہستہ آہستہ

.....

اثرِ بادۂ جوانی ہے
کر گیا ہُوں سوال کچھ کا کچھ

.....

جسے عشق کا تیر کاری لگے
اُسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

ولی کوں کہے تو اگر یک بچن
رقیباں کے دِل میں کٹاری لگے

.....

ولی اُس گوہرِ کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی
مرے گھر اِس طرح آتا ہے جیوں سینے میں راز آوے

کہاں ہے آج یارب جلوۂ مستانۂ ساقی
کہ دِل سوں تاب جی سوں صبر سر سوں ہوش لے جاوے

.....

سراج اورنگ آبادی کے اُردو کلام کی صفائی اور سادگی حیرت انگیز ہے۔ تکلّف و بناوٹ کا نشان نہیں۔ پُرگوئی، شعری تجربے، تنوع، پھیلاؤ اور شدتِ اِظہار کے لحاظ سے اُن کا شُمار اُن شعراء میں کیا جانا چاہیے جنھیں قدرت نے خاص عطیۂ سرشاری سے نوازا ہوتا ہے اور بے قراری کی ایک لپک اُن کے قلبِ تپاں میں بھری ہوتی ہے۔ سراج کو جذب و کیف کی ایسی دولت ودیعت ہُوئی

تھی جس میں شعر از خود اُن کی زبان پر جاری ہو جاتے تھے جو ایک طرف محافلِ سماع اور دوسری طرف عوام الناس کے ذوق کا سامان بہم پہنچاتے تھے۔ یہ امر حیرت کا باعث ہے کہ سراج کا سارا کلام اُن کے تقریباً سات سالہ شعری تجربے کی دین ہے کہ چوبیس برس کی عمر میں وہ اپنے مرشد شاہ عبدالرحمان چشتی کی ہدایت پر شعر گوئی ترک کر دیتے ہیں۔ تصوف کی طرف بڑھتے ہُوئے جب اُن کے اندر عشقِ مجازی کا شعلہ دھیما پڑنے لگا تو اِس کے ہمراہ اُن کی شاعری کا چراغ بھی مدھم ہو کر بجھ جاتا ہے لیکن یہ طے ہے کہ سراج کی بیشتر شاعری کا محور محبوبِ مجازی ہے تاہم وہ اِس راستے سے سلوک کی منزلیں طے کر گئے جو صوفیا کا حصّہ ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سراج کی عاشقانہ غزلیں بھی مہذب نظر آتی ہیں اور اُن میں اپنے زمانے کی وہ جذباتی بے لباسی نہیں جو جسمانی وصل کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتی۔ وہ ایک سچے عاشق کے رستے پر گامزن تھے جس کے اظہار میں وہ ولی سے بازی لے جاتے ہُوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ولی کے بعد دکن میں غزل کا چرچا سراج ہی کی بدولت دوبالا ہُوا۔ اُن کے ہاں بیرون کی نشاطیہ کیفیت کے برعکس اندرون کی اداسی جھلک دیتی ہے جو عشقِ حقیقی اور مجازی کے امتزاج سے جنم لینے والے ہجر کی دین کہی جا سکتی ہے۔

یہاں سراج کی بزرگی، اولیت اور زمانۂ شاعری کے بارے میں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ جمیل جالبی سراج کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ''ولی کے بعد اور دور میر و مرزا سے پہلے کے درمیانی عرصے کے سب سے بڑے شاعر ہیں'' (تاریخ ادب اردو، جلد اول، مجلسِ ترقی ادب لاہور جنوری ۱۹۸۴ء۔ ص۔۵۶۶)۔ اُن کی اِس رائے سے مجھے اتفاق نہیں ۔ سراج کی پیدائش ۱۷۱۵ء کی ہے جب کہ میرزا رفیع سودا ان سے نو برس پیشتر ۱۷۰۶ء میں پیدا ہُوئے۔ ۱۷۳۹ء میں چوبیس برس کی عمر میں سراج کا دیوان سامنے آتا ہے جس میں ۱۷۳۴ء سے ۱۷۳۹ء تک کا پانچ سال کا کلام شامل ہے۔ گویا یہ انیس سے چوبیس برس کی عمر کے درمیان میں کی گئی شاعری پر مشتمل ہے۔ جمیل جالبی سراج کے متعلق مزید لکھتے ہیں کہ ''جب بارہ سال کے ہُوئے تو --- عالمِ بے خودی میں فارسی اشعار منھ سے بے ساختہ جاری ہوتے'' (ایضاً ۔ ص۵۶۷) گویا یہ کیفیت ۱۷۲۷ء کے لگ بھگ شروع ہُوئی ہو گی۔ ''عبرت الغافلین'' میں سودا نے لکھا ہے کہ ''بندہ ہم از چہل و پنج سال اوقات خود را در فنِ ریختہ ضائع ساختہ است (بحوالہ ''کلیاتِ سودا'' جلد دوم ۔ نولکشور

لکھنو ۱۹۳۲ء - ص ۴۲۴) - سودا ۱۷۷۴ء میں لکھنو میں تھے جب عبرت الغافلین لکھی گئی- ۱۷۷۴ء سے پینتالیس منہا کریں تو ۱۷۲۹ء کا سن نکلتا ہے جب سودا نے خود اپنے بیان کے مطابق ریختہ کا آغاز کیا- ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے سودا کی مشقِ سخن کا آغاز ۱۷۲۸ء بتایا ہے (اردو ادب کی تاریخ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء - ص ۲۹۱) جو درست معلوم ہوتا ہے - اس اعتبار سے سراج اور سودا کی شاعری کے آغاز کا زمانہ ایک ہی ٹھہرتا ہے اور سراج کسی لحاظ سے بھی سودا کے بزرگ نہیں بنتے کہ انھیں ''مرزا سے پہلے'' کا شاعر تسلیم کیا جائے- یہ بات الگ کہ سودا نے قریباً بائیس برس کی عمر میں اور سراج نے محض بارہ برس کی عمر میں شاعری شروع کی- سراج نو عمری میں ہی درویشی اور پاک بازی کی اُس منزل پر پہنچ چکے تھے جہاں محافل میں علما اور مشائخ تک آپ کے روبرو با ادب بیٹھتے تھے- توحید و معرفت کے مضامین بغیر کسی تکلف و بناوٹ کے سراج کے ہاں شگفتگی کے ساتھ بیان ہُوئے ہیں- اُن کی شاعرانہ زبان قدیم دکنی اُردو اور اُس وقت کی دہلوی اُردو کے ساتھ جوڑتی ہُوئی محسوس ہوتی ہے- وہ ولی کے بعد اُردو کے نمایاں ترین شعرا میں شمار ہوں گے تاہم ان کا مرتبۂ شاعری میر و مرزا سے کسی طور بھی بلند نہیں ہوتا- اگر انھوں نے یہ غزل نہ کہہ رکھی ہوتی تو وہ شاہ حاتم سے بھی مار کھا جاتے اور مظہر جانِ جاناں اور عبدالحئی تاباں کے ساتھ کھڑے نظر آتے-

خبرِ تحیرِ عشق سُن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو مَیں رہا نہ تو تُو رہا جو رہی سو بے خبری رہی

شہِ بے خودی نے عطا کیا مجھے اَب لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

چلی سمتِ غیب سے وہ ہوا کہ چمن سُرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دِل کہیں سو ہری رہی

وو عجب گھڑی تھی مَیں جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق میں جو دھری تھی تیوں ہی دھری رہی

.....

اُن کی یہ غزل اُردو غزل کی تاریخ میں نہایت اہم مقام رکھتی ہے- اس کے علاوہ اُن کی غزلیات سے اگر انتخاب کیا جائے تو درج ذیل اشعار پر نظر ٹھہرتی ہے:

دو رنگی خُوب نہیں یک رنگ ہو جا
سراپا موم ہو یا سنگ ہو جا

.....

تجھ ہجر کی اگن میں ہے اَب سراج بیکل
آتش میں دیکھ آ کے سیماب کا تماشا

.....

آب رواں ہے حاصلِ عمرِ شتاب رو
لوحِ فنا میں نقش نہیں ہے ثبات کا

بے کسی مجھ سیں آشنا ہے سراج
نہیں تو عالم میں کون ہے کس کا

.....

سراج اس شعلۂ رُو سیں ہرگز گلہ روا نہیں ہے عاشقوں کا
تمام جلتی ہے شمع ہر شب عبث پتنگوں کا نام ہے گا

.....

کیوں نہ جل جاوے گھر خرد کا سراج
عشق و دِل پنبہ و شرار ہُوا

.....

جس کا دل شوق میں جیوں آئنہ حیراں نہ ہُوا
سب ہُوا لائقِ ہم چشمیٔ جاناں نہ ہُوا

.....

سب جگت ڈھونڈ پھرا یار نہ پایا لیکن
دل کے گوشہ میں نہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

.....

چشمِ طمع کوں جلوۂ موہوم ہے مراد
یاسے کوں ہے سراب میں عین الیقین آب

.....

گنجِ ازل لگا ہے دلِ بے نوا کے ہات
آیا ہے کیا خزانۂ غیبی گدا کے ہات

.....

پردۂ چشمِ دل اگر وا ہوئے
مظہرِ دوست ہے در و دیوار

.....

روشن ہے اے سراج کہ فانی ہے سب جہاں
مطرب غلط ہے جام غلط انجمن غلط

.....

چشمِ عبرت سیں تماشائے جہاں کرتا ہوں
خاک در خاک ہے یہ انجمنِ گل در گل

.....

مت ہو مغرور زندگی میں سراج
آمد و رفتِ دم ہے کوسِ رحیل

.....

کیا بلا کا ہے نشہ عشق کے پیمانے میں
کوئی ہشیار نہیں عقل کے کاشانے میں

.....

پتھر بھی نہیں ہے شررِ عشق سے خالی
بے تابیٔ نبضِ رگِ خارا کی خبر لو

.....

اِس میں کوئی شک نہیں کہ ولی کا نام اپنی اوّلیت کے باعث زیادہ نمایاں نظر آتا ہے لیکن سراج اور ولی کے منتخب اشعار ایک ساتھ پڑھیں تو سراج کے اشعار عمودی پرواز اور عشقِ حقیقی کی جانب مائل نظر آتے ہیں جبکہ ولی کے اشعار کی سطح مجازی اور متوازی دکھائی دیتی ہے۔ مزید یہ کہ ولی کی جو غزل اُن کی نمائندہ بنتی ہے (ردیف آہستہ، آہستہ) اُس کا سراج کی نمائندہ غزل (ضمیرِ تحیرِ عشق سُن) سے موازنہ کریں تو سراج کی غزل ولی کی غزل سے کہیں بہتر محسوس ہوتی ہے۔ اِس بنا پر سراج کو ولی سے بہتر شاعر کہا جا سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

قلم میں بند پندرہ سال

پوٹھوہاری زبان وادب اور ثقافتی معاشرتی وسیب کے نمائندہ شہر ''گوجر خان'' کے جنوب کی جانب سے راولپنڈی سے لاہور جاتے ہوئے ۴ کلومیٹر کے فاصلے پر گوجر خان کے مقبول اور قدیم قصبے ''گلیانہ'' سے تعلق رکھنے والے ایک ہمہ جہت قلم کار کو لوگ امتیاز گلیانوی کے نام سے جانتے اور یاد کرتے ہیں۔ امتیاز صاحب نے اپنی ادبی زندگی کے باقاعدہ آغاز کے دنوں ہی سے لفظ ''گلیانہ'' ظاہر ہے اپنی جنم بھومی کے عشق میں سرشاری کے کسی دل دار سے میں اپنے نام کا لاحقہ بنایا۔ اور پھر اس طرح اس عاشقانہ وابستگی کا بھرم رکھا۔ حبیب جالب نے تو کہا تھا کہ ''جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے'' مگر یہ جہاں بھی گئے گویا ''گلیانہ'' چھوڑ آئے۔

سعودیہ، فرانس اور اٹلی سے ہوتے ہوئے گزشتہ ایک دہائی سے برطانیہ کے شہر ''سوینڈن'' میں مقیم ہیں اور یہاں بھی اپنی ماں بولی اور اس سے تعلق خاطر رکھنے والے افراد، اس کے مظاہر، اُس کے دائم آباد کوچوں اور بازاروں کی سدا بہار رونقوں کی خوشبوؤں سے اپنے قلب و روح مہکائے ہوئے ہیں۔ ان کا تخلیقی امتیاز، اظہار کے کئی رخوں کو واضح کرتا ہے۔ متنوع موضوعات اور متفرق اصناف میں کامیاب طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ ان کے تخلیقی اوصاف کے بارے میں اشفاق احمد کہتے ہیں:

''ایک سے زیادہ اصناف میں طبع آزمائی کرنے والے تخلیق کار عموماً ''ماسٹر آف نن'' پر ختم ہوتے ہیں لیکن امتیاز گلیانوی کے بارے میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے۔ انھوں نے جس صنف میں بھی کام کیا اس کا حق ادا کر دیا۔ خواہ شاعری ہو، صحافت ہو سفرنامہ ہو یا افسانہ نگاری ہو۔''

جب کہ منشا یاد ان کی کہانیوں کو اِن الفاظ میں سراہتے ہیں،

''امتیاز گلیانوی کے اندر ایک اچھے کہانی کار کی تمام خوبیاں موجود ہیں اور وہ محبت اور غربت جیسے بنیادی مسائل اور معاملات کو دل سے محسوس کرتے ہیں اور اہم تر بات یہ ہے کہ زبان و بیان کے اعتبار سے ان کی کہانیاں اچھی اور بھرپور ہیں۔''

اسی طرح نامور شاعر نذیر قیصر ان کے فکری و فنی سفر کو بنیاد بناتے ہوئے رقم طراز ہیں،

''امتیاز گلیانوی کی تحریروں میں اپنی زمین کی خوشبو ہے اور ہریالی بھی۔ وہ پڑھنے والے کو لمس، بصارت اور مہک سے نہ صرف آشنا کرتے ہیں بل کہ ان سب اشیاء کو لفظ لفظ مجسم کر کے قاری کی روح میں اتار دیتے ہیں۔ امتیاز صاحب کی تحریریں جیتی جاگتی اور سانس لیتی ہوئی تحریریں ہیں جو اپنی قومی زبان کی ترجمان بھی ہیں اور پوٹھوہاری ورثے کی نمائندہ بھی۔ بڑے شہروں سے دور رہ کر مجید امجد اور ظفر اقبال کی طرح امتیاز گلیانوی جیسے لکھنے والے زندگی کو جس طرح خوبصورت، بامعنی اور تخلیقی بنا رہے ہیں، وہ ایک تاریخ ساز کام ہے۔''

معاصر عہد کے جن معروف کہانی کاروں نے قلم میں بند پندرہ سال' میں موجود کہانیوں کی تحسین کی ہے ان میں معروف شاعر و افسانہ نگار نعمان منظور بھی شامل ہیں جن

کا کہنا ہے کہ ہجرت، وصال، محبت اور اپنے پیاروں سے دوری نے انھیں ایسے عمدہ موضوعات کے بارے میں لکھنے پر مجبور کر دیا، جو صرف اپنے وطن سے دور اور ایک سچا انسان ہی کر سکتا ہے۔ یہ نہ صرف ایک سچے اور کھرے انسان ہیں مس کہ ان کی نثر میں روانی، کسی پہاڑ سے بہتے ہوئے شفاف، ٹھنڈے اور (بعض اوقات) معجزاتی پانی کی طرح ہے، جس کا ایک گھونٹ انسان کے رگ و جاں میں فرحت بخش دیتا ہے۔ ان کی کہانیوں کے موضوعات اسلوب اور سطر سطر تازگی، ان کی ہجرت کی گواہی دیتی ہے۔''

متعدد کتب کے ساتھ ساتھ گزشتہ سال ''ستارے ہمسفر میرے'' کے عنوان سے ان کا ایک اردو شعری مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

''قلم میں بند پندرہ سال'' کا انتساب امید و رجائیت کے احساس سے بھرپور ہونے کی بنا پر قاری کے دل میں آس اور روشن مستقبل کی امنگ جگاتا ہے۔ انتساب کے الفاظ اس طرح ہیں:

''امید، امن اور محبت کی اس صبح کے نام _ جو اِک دن ضرور آئے گی۔

مذکورہ مجموعے میں شامل کہانیوں کی مجموعی تعداد سترہ (17) ہے جنھیں درج ذیل عنوانات سے مزین کیا گیا ہے۔

موازانہ، مردہ گائے کے پائے، شفقتِ پدری، قلم میں بند پندرہ سال، خود غرضی، مس گلیانوی، معکوس راہیں، ایک سچی کہانی، پسِ آئینہ، سچا جھوٹ، جھوٹا سچ، فیتا پاشیا، کانچ کے خواب، عقل کا ماتم، ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں، جب موسم بدلتا ہے، احساسِ زیاں، مشرق و مغرب۔

ان کی تخلیقات کا مرکزی محور کہانی اور کہانی سے جڑی ہوئی صداقت پسندانہ زندگی، اس کے کردار اور ان کرداروں سے اُبھرنے والا سچا طرزِ احساس ہے۔ ان کا اردو افسانوی مجموعہ ''قلم میں بند پندرہ سال'' کی اوّلین اشاعت 2001 میں منظرِ عام پر آئی تھی۔ مذکورہ مجموعے میں شامل کہانیوں کو کہانی کاروں کی دنیا کے متعدد بڑوں نے بھی سراہا تھا۔ اس کی موجودہ دوسری اشاعت دراصل اس کی مقبولیت اور اہمیت کا ایک اعتراف بھی ہے اور اس اعتراف کا قومی اشاعتی ادارے نیشنل بک کونسل نے کیا ہے جو مصنف کے لیے کسی ادبی اعزاز سے کم نہیں ہے۔

کہانی پن کے تصور کو بنیاد بنانے والے اس مجموعے میں ممکنہ حد تک فن کے تقاضوں کی پاسداری میں رہتے ہوئے ہر کہانی کے منطقی انجام میں ایک واضح مقصدیت ایک روشن پیغام کرداروں کی زبانی قارئین کو سوغات کیا گیا ہے۔ مصنف نے اپنے تخلیقی اظہار کے وسیلے سے وہ چھوٹے چھوٹے واقعات جو ہماری روزمرہ زندگی میں جنم لیتے ہیں مگر عام آدمیوں کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں، ان کی جزئیات و کیفیات کو ایک فنی توازن کے ساتھ اس فطری اور والہانہ انداز و اسلوب میں کہانی کے تار و پود میں شامل کیا ہے کہ ہر کہانی کسی نہ کسی کردار میں ایک جیتی جاگتی سچائی بن کر نمودار ہوگئی ہے۔

☆☆☆☆☆

نثار ترابی

نثری نظم کی ہیئت، قواعد وضوابط

پہلے تو ایک طویل عرصہ نثری نظم کی قبولیت اور رد پر بحث ہوئی۔ پھر جب استرداد کمزور پڑا تو شاعری جنھیں چھو کر بھی نہیں گزری تھی وہ بھی اناپ شناپ لکھ کر شاعر بن بیٹھے۔ کچھ نے لایعنیت کی آڑ میں دکان سجائی تو کسی نے بدیسی زبانوں سے تراجم کا لب ولہجہ اپنا لیا۔ دوسری طرف اگر کسی مقبول عام شاعر نے صنف کو شعری خدوخال عطا کیے تو نشانہ باندھ کر انھیں نثری نظم لکھنے والوں کی فہرست سے خارج کر دیا گیا۔ المیہ یہ بھی رہا ہے کہ ہم ہمیشہ یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ یہ تعلیمی نصاب کی ذمہ داری ہے کہ وہ اصناف کی تعریف کرے اور ہیئتوں کے خدوخال کی ترتیب کی وضاحت کرے لیکن جہاں نصاب ہی مصنوعی اور سازشی ہو اور اسے پڑھانے والے کسی قسم کا نان کالونیل علمی وادبی نظریہ قبول کرنے پر تیار نہ ہوں تو کسی علمی پیش رفت کی کیسے امید لگائی جا سکتی ہے۔

میں نے علمی وادبی معاملات میں ان ہی لوگوں کو تنگ نظر پایا ہے جو علم وادب کے تعلیم وتدریس کے پیسے لیتے ہیں۔ اس ساری صورتحال سے نتیجہ یہی نکالا جا سکتا ہے کہ نظریہ سازی اور نصابی کوتاہیوں کی نشاندہی کی ذمہ داری اب صاحب اخلاص و ادراک تخلیق کاروں کو ہی اپنے سر لینی پڑے گی۔ یہ جانتے ہوئے کہ یہ تہذیب کے تحفظ کی جنگ ہے جو نصاب بنانے اور پڑھانے والوں سے لڑنا ہوگی۔ یقین جانیے ہمارے علمی و ادبی ارتقا کی کسی بھی کوشش کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تعلیمی اداروں میں پنجے گاڑے بیٹھے کالونیل منشی ہیں جو آج بھی انسان دشمن سامراجی نصاب کی نوپیاں پہنا کر ہماری نسلوں سے تخلیقی و تجزیاتی فکر کو چھین لینے کی ڈیوٹی دے رہے ہیں۔

نثری نظم کے معاملے میں میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہمیں اب اس کے خدوخال ترتیب دینے کے لیے مغرب سے رہنمائی لینے کی ضرورت نہیں۔ کم از کم پون صدی کے بعد تو ہمیں اس قابل ہو جانا چاہیے کہ ہم اس کی ہیئت کی بنیادی آوٹ لائن وضع کریں۔ اگرچہ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جنگلی پھولوں سے لیکر پہاڑی ندیوں تک اور ایک بچے کی مسکراہٹ سے لیکر کسی ہرن کی اٹھکیلی تک فطرت کی صناعی سب شاعری ہے لیکن اس کے لیے فطرت نے کس قدر اہتمام سے کام لیا ہے یہ ذرا کبھی ماہرین سے جا کے پوچھیں۔

فرحت عباس شاہ

اگر نثری نظم شاعری کی صنف ہے تو پھر اسے بھی اسی طرح سیکھنا اور سمجھنا پڑے گا جس طرح مثنوی، رباعی، غزل، آزاد غزل اور آزاد نظم کی ہیئت اور صنف کو سمجھنا اور سیکھنا پڑتا ہے۔ غزل کا مصرعہ بے وزن ہو جائے، قافیہ بے قاعدہ ہو جائے، عیب تنافر دکھائی دے، شتر گربہ آ جائے، حتیٰ کہ ردیف ہی کہیں پوری طرح چمک نہ دکھا سکے تو شعرا و ناقدین بول اٹھتے ہیں لیکن یہ کیا تضاد ہے کہ نثری نظم جو کسی موجود سہارے کے بغیر شعریت کی تجسیم کا نام ہے بغیر کسی اصول اور قاعدے کے لکھی جاتی رہے اور جس کا جو دل کرے لکھ کے کہے یہ نثری نظم ہے۔ ویسے تو اب غزل کا حال بھی یار لوگوں نے انتہا درجے کا خراب کر کے رکھ چھوڑا ہے لیکن ہمیں بہر حال کہیں نہ کہیں تو اپنا کردار ادا کرنا ہی ہوگا۔

ایک اور بات جو مدنظر رکھنا بہت ضروری ہے کہ کوئی نثری نظم کیوں لکھتا ہے؟۔ کیا صرف اس لیے کہ اسے غزل اور نظم لکھنا نہیں آتی اور وہ وزن میں لکھنے سے قاصر ہے؟ تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ نثری نظم کوئی ایسی صنف ہے جو اس لیے لکھی جاتی ہے کہ کوئی اوزان، بحور اور عروض نہیں جانتا اس لیے نثری نظم کو آسان سمجھ کر اپنے خیالات جس طرح چاہے لکھ ڈالے۔ اگر آسانی کا یہی کلیہ قبول کر لیا جائے تو پھر اسے نثری نظم ہی کیوں کہا جائے؟ خیالات یا اظہاریہ کیوں نہ کہا جائے۔ دوسری یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ اگر کوئی تخلیق کار، کہانی، غزل اور نظم کہنے پر قادر ہے تو پھر اس کے پاس نثری نظم کہنے کا کیا جواز ہے۔ کیا صرف اس لیے کہ اس کے کریڈٹ پر ایک اور صنف آ جائے؟۔ شاعری کے ساتھ ایسا کھلواڑ وہی کرے گا جس کے نزدیک شاعری محض چابکدستی اور ہنرمندی کا کام ہے۔ میں ایسے بیشمار مشقتی شعرا کے نام گنوا سکتا ہوں جنھوں نے مصرعہ سازی اور قافیہ و ردیف پیمائی میں مہارت کی بنیاد پر بے رس اور بے تاثیر شاعری نما کوئی چیز گھڑی، مشہور ہوئے اور پھر اپنی لکڑی سے بنی اور لوہے کی ڈھلی شاعری سمیت منوں مٹی تلے جا سوئیں۔

میرے نزدیک نثری نظم لکھنے کا سب سے بڑا جواز ہی یہ ہے کہ یہ صنف ایسی کیفیات، احساسات، خیالات اور فکر کو ایک مختلف لسانی اسلوب اور استعاراتی و تشبیہاتی نظام کے ساتھ اپنے دامن میں جگہ دیتی ہے جو غزل یا نظم یا دوسری اصناف میں سما نہیں سکتے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ نثری نظم کا مصرعہ بتائے کہ وہ نثری نظم کا مصرعہ ہے۔ یہاں تک کہ اسے مرصع اور تخلیقی نثر سے بھی مختلف رہنا ہوگا۔ ہمیں وہ حدِ امتیاز اور خطِ فاصل کھینچنا ہوگا جو ان اصناف کے اپنے اپنے ہیئتی دائرے اور صنفی انفراد کا اعلان کرے۔

میری نظر میں ذیل میں دیئے گئے دس نکات نثری نظم کے خدوخال کی وضاحت کرنے کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

1- نثری نظم سے مراد نثر میں پیدا کی گئی نظم کی ہیئت ہے۔

2- نثری نظم قطعی طور پر نثر کے فقروں کو پیراگراف میں لکھنے کے بجائے پیراگراف کو توڑ کر آزاد نظم کی شکل دیتی ہوئی لائنوں پر

مشتمل نہیں ہوتی کیونکہ اس سے یہ نثر ہی رہتی ہے جسے لائنوں میں لکھا گیا ہو

3- نثری نظم اور نثر کا پہلا فرق یہ ہے کہ اس صنف میں نثری فقرے نہیں ہوتے بلکہ نثری مصرعے ہوتے ہیں۔

4- نثر میں رہ کے مصرعہ بنانا ہی وہ کمال ہے جو نثری نظم کے شاعر کا پہلا مرتبہ بتاتا ہے۔ مصرعہ جتنی طاقتور شعریت لیے ہوئے ہوگا اور باطنی ردھم کی ساتھ ہوگا نظم اتنی ہی عمدہ قرار دی جا سکے گی۔

5- اگر کسی شاعر کو نثر کا مصرعہ بنانا نہیں آتا تو اسے نثری نظم کا پتہ نہیں ہے۔ یا اگر نثری نظم میں منظوم مصرعے کی پہچان نہیں رکھتا تو سمجھیں صنف سے انجان ہے۔

6- نثر کے فقروں کو آپس میں جوڑنے والے حروف ربط مثلاً تاکہ، چونکہ، اور، پھر، اگر، مگر، اس لیے کہ، جیسا کہ وغیرہ وغیرہ کا استعمال جتنا زیادہ ہوگا وہ نظم کم اور نثر زیادہ ہوتی جائے گی۔ یہی حروف نثر اور نظم کے درمیان خط امتیاز کھینچتے ہیں۔ اس لیے خیال رکھا جانا چاہیے کہ یہ کم سے کم استعمال ہوں اور جہاں ہوں وہاں مصرعے کا وزن، ردھم اور تاثر بڑھا دیں۔

7- نثری نظم غیر عروضی ہوتی ہے لیکن بے وزن نہیں ہوتی - البتہ اس میں خارجی کے بجائے باطنی ردھم ہوتا ہے

8- نثری نظم جداگانہ طرز احساس کے حامل اسلوب کا تقاضا کرتی ہے۔ ایسے موضوعات، ایسا طرز احساس اور ایسا لسانی، استعاراتی و تشبیہاتی قرینہ جو غزل و نظم میں برتا جائے تو نامانوس لگے مگر نثری نظم میں آئے تو اس کے صنفی تقاضوں کو پورا کرے

9- نثری نظم چونکہ بحور اور قافیہ ردیف کی مدد کے بغیر شاعری کرنے کا نام ہے اس لیے یہ باقی اصناف کی نسبت زیادہ طاقتور شعری مواد اور تخلیقی سلیقے کی متقاضی ہے۔ یہ ایک بہت مشکل صنف سخن ہے جسے آسان سمجھ لیا جاتا ہے

10- نثری نظم میں کہانی نہیں ہوتی نظم ہوتی۔ اسے مرصع اور تخلیقی نثر سے بھی مختلف نظر آنا چاہیے۔

ذیل میں چند ایک نظموں کی مثالیں پیش خدمت ہیں

''دم رخصت''

نسرین انجم بھٹی

تپے ہوئے لہجے میں خاموش رہنے والا
آنکھوں تک سلگ اٹھا ہوگا
اس کی سانسوں سے میرا دم رک گیا
اور میری ہتھیلیاں دھڑکنے لگیں
میرا مرد پورے چاند کی طرح مجھ پر چھا گیا
وہ آگ سے مرتب ہے
میرے انگ انگ میں پگھلنے کی آرزو ہے
اس کے لمس میں میرے خمیر کی خوشبو کہاں سے سما گئی
کہ میں اپنی تلاش میں اس تک آ پہنچی
اس کی آنکھوں میں میری آنکھیں تھیں
جب اسے مجھ سے جدا کیا گیا
وہ دروازے سے باہر بھی دروازے کے اندر تھا
اور میں دروازے کے اندر بھی دروازے سے باہر تھی

''آپے رانجھا ہوئی''

نسرین انجم بھٹی

مغربی صحرا کے کنارے کندن کے پھول کھلنا
شروع ہو گئے ہیں
مشرقی صحرا کے بیچوں بیچ کھڑی سندری کی
ناک کا لونگ مرجھا گیا ہے
یہ کس تاریخ کے اخبار کی خبر ہے
کوئی اشتہار ہے کیا
دیواروں پہ لکیریں نہ ڈالو
مٹاؤ گے تو تمہارے ہی ہاتھ کالے ہوں گے
ہاں کھیل کھیل میں ہی دلالی سیکھ جاؤ گے
کوئلوں کا تو بہانہ ہے
کوئلے چار دن اور دہک رہے ہیں
بجھے میرے دل میں گے ہیں مجھے اب بھی سردی لگتی ہے
برف کی وہ ڈلی پگھلتی کیوں نہیں جس کی آئینے جیسی سطح پر
میرا چہرہ بھی مجھے دکھائی نہیں دیتا
درمیان کون حائل ہے
گرم لرزتے ہوئے آنسو اور ملنے کی تانگھ
آنسوؤں کے جھکولوں میں ہمارے چہرے
ڈس لوکیٹ ہو گئے
اور پھر سانس سے سانس نہ ملی
دم میں دم نہ آیا
رانجھا رانجھا کوکدی میں آپے رانجھن ہوئی

''محبت اور فطرت''

مبارک احمد

جب آنکھ لڑائی ہم نے
بجلی چمکی
جب ہاتھ ملایا ہم نے
بادل گرجا
جب پریت لگائی ہم نے
بارش برسی

''خود ساختہ بے ساختہ''

فرحت عباس شاہ

کالے ہاتھ
آسمان سے لٹک رہے ہیں
زمین کو چھوتے ہیں ریت اڑاتے ہیں
کھایا پیا ہضم ہو جاتا تو کچھ بات ہی نہ تھی
خالی پیٹ موت شاید ہی کسی کو پسند ہو
سوائے جھوٹے دلاسوں اور سبز خوابوں کے
ہے ہی کیا
کیوں نا کسی دن کھایا پیا ہضم کیا جائے
ضمیر سے بوجھ کون ہٹائے گا
خود ساختہ ضمیر
بوجھ
بس موت ہی بے ساختہ ہے
اور کالے ہاتھ
جو آسمان سے لٹک رہے ہیں

''وطن ہمیشہ''

فرحت عباس شاہ

کبھی کبھار
رات کھانستی ہے
بوڑھا سکوت تلملا اٹھتا ہے
پڑوسی چونک جاتے ہیں

اور حیران ہوتے ہیں
کبھی کبھار چپ گھبرا جاتی ہے
اور بیمار پڑ جاتی ہے
شاموں نے جتنے قرض اٹھائے تھے
دنوں کو چکانے پڑ رہے ہیں
غریب دن دھوپ بیچتے پھرتے ہیں
گلی سڑی بے بنیاد دھوپ
کبھی کبھار
ویرانی اٹھ کر چلنا شروع کر دیتی ہے
گلیاں اُداس ہو جاتی ہیں
سڑکیں گھبرا جاتی ہیں
بازار پریشان ہو جاتے ہیں
اور خالی بھی
تاکہ بے رونقی بیچی جا سکے
شاید کوئی خرید ہی لے
یہاں کسی کا کیا پتہ

.....

''لوحِ بادگرد''

.....فرحت عباس شاہ.....

تمہارے لیے آنکھیں بیچ دیں
کلائیاں باندھ کے گروی رکھ آیا
دل کو دو دیواروں کے درمیان زندہ دفن کر دیا
قسمت کی تنگدستی پھر بھی آڑے آئی
تمہارے خوشی کی سطح پر قربانیاں دفن ہوتی گئیں
اب بازار والے کہتے ہیں
بچا کھچا اپنا آپ واپس لے جاؤ ہم کباڑ نہیں خریدتے
اپنا آپ واپس لے آتا ہوں
تمھارا سوگ کچھ اور مانگتا ہے
بھٹکے ہوئے نصیبوں کی تلاش بہت جان لیوا کام ہے
قدم قدم پر اُلٹے سیدھے راستے گھیرا ڈال لیتے ہیں
میں نے سمجھا تھا
آنکھیں بیچ کے تمھیں روشنی لا دوں گا
اجالے تمہارے قدم چومیں گے
کلائیاں گروی رکھ آؤنگا
بدن مشقتوں سے رہائی پا لے گا
دل دفنا دوں گا
تمہیں کبھی مجھ پر شک نہیں ہوگا
بھٹکے ہوئے نصیبوں کی تلاش بہت جان لیوا کام ہے
قدم قدم پر اُلٹے سیدھے راستے گھیرا ڈال لیتے ہیں

.....

''مشکل کا مسافر''

.....ڈاکٹر ابرار عمر.....

چشموں کا پانی پی کر
جوان ہونے والی لڑکی
چہرے پر چاند سجا
اور پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنے میں
میری مدد کر
جب تو میری زندگی میں
پوری کی پوری آجائے گی
میں تجھے دھوپ پہن کر
صحرا میں چلنا سکھاؤں گا

.....

''زندگی پھولوں کے کھلنے کی منتظر ہے''

.....ڈاکٹر ابرار عمر.....

آزادی کے رنگ
وحشی رت کے ہاتھوں نے مٹا دیے ہیں

سورج دھرتی پر خوفزدہ شعاعیں پھینکتا ہے
ہوائیں ماضی کے راز بتانے سے ڈرتی ہی
ان کہے لفظوں کے بوجھ سے کانپتی ہیں
شہر کی مصروف گلیوں میں
سچ کے کتنے پرچم جلائے جا چکے ہیں
کتنی آوازیں خاموش کر دی گئی ہیں
خواب گم شدہ ارمانوں کی
دھند سے لپٹے ہوئے ہیں
محبت کے دل کی دھڑکن
طاقت کی ڈرم بیٹ کے شکنجے میں ہے
انصاف کے ایوان قدیم کھنڈر بن چکے ہیں
خوف کا بھوکا بھیڑیا دندناتا پھر رہا ہے
سچائی کی سیاہی کو
دھوکے کا صحرا چاٹ گیا ہے
لوہے کے مکوں اور پتھر کے دلوں والوں نے
طاقت اور بے بسی کے درمیان
دیوار کھینچی ہوئی ہے
امید اس بے پناہ تاریکی میں
طوفان میں ایک اپاہج شعلے کی مانند
جل بجھ رہی ہے
مایوسی کی گہرائیوں میں
بغاوت کے بیج جڑیں پکڑ رہے ہیں

.....

''کیوں؟''

نجمہ منصور

محاذ جنگ پر تنہائی بھی پھانسی لے لیتی ہے
جھیل کے پانی پر دائرے بنے کا عمل
آپ ہی آپ نہیں ہوتا
کوئی جوار بھاٹا، کوئی کنکر
محبت، جدائی اور اداسی کی نظمیں لکھتے لکھتے
میں جنگ اور موت کی نظمیں لکھنے لگی ہوں
کبھی سوچا ہے کیوں؟
انسان نے جنگ ایجاد کی
خدا نے موت
دنیا نے محبت کو یرغمال بنا لیا
اب آنے والے کئی زمانوں تک
محبت کو بازیاب کرانے کے لیے
مجھے لکھنی ہیں
جنگ اور موت کی نظمیں
پتہ ہے کیوں؟

.....

''ان کے کپڑے نہیں جسم پھاڑ ڈالو''

نجمہ منصور

ان کے کپڑے نہیں جسم پھاڑ ڈالو
جیسے گلاب کو پتی پتی بکھیرتے ہیں
ان کا انگ انگ ادھیڑ کر رکھ دو
بھنبھوڑو، کاٹو
کاٹ کاٹ کر کھاؤ
اور جشن مناؤ
کوئی آئے گا
ان کے دریدہ بدن کو
صندوق میں بند کر کے
دریا برد کر دے گا
وہ پھر بھی کنارے لگ جائیں
تو ان کے لخت لخت بدن کو
کسی دلدلی زمین میں گاڑ دینا

وہ زمین کی کوکھ میں گھر بنا لیں گی
کہ دنیا ان کے لیے
اس سے بڑی اندھی قبر ہے
دکھ کا فولادی چکر چلتا رہے گا
رات دن کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی رہے گی
مان لو کہ
آدھا سورج آدھا چاند اور آدھی عورت
موت کے ساتھ لڑتے لڑتے
آخر ایک دن ڈھل جاتے ہیں!

.....

''زندگی''

.....مقبول خاں مقبول.....

زندگی ازل سے سارے پانیوں کو عبور کرتی ہوئی
پھر ایک سنگم پر آ ٹھہری ہے
قدامت کی کوکھ میں نئی چنگاریاں سلگ رہی ہیں
جیسے نیا سورج چمکنے کو ہے
لٹوں سے دریاؤں کے سوتے
دور جدید کا بدل نہیں ہو سکتے
سوچتا ہوں
تم کسی زمانے میں میرے وجود کا حصہ تھے
لیکن کسی دیوتا نے
جانے کیوں
میرے وجود سے تمہیں علاحدہ کر دیا
میں خود کو تلاش کرتا رہوں
جستجو
میرے خوابوں کو چھوتی رہی
اک نیا دور آئے گا
جہاں فاصلے نہیں ہوں گے

''حرف ایک جنگل''

.....انیس ناگی.....

کتابیں میرا جنگل ہیں
جنھیں میں کاٹ کر اب بارہویں زینے پر بیٹھا ہوں
معانی کے ہیولوں میں چمکتی صورتوں سے دور تنہا
حرف کے صدمات سہتا ہوں
کہ میں خود آگہی کے بھاری سانسوں کا سمندر ہوں

جسے نمکین پانی کی سزا آبادیوں سے
بادبان کی طرف کافی دور رکھتی ہے

کتابیں میرا جنگل ہیں
جہاں پر نفرتوں کی تیز دھڑکن

برتری کی چیختی آواز کی دستک نہیں
جو صبح کو میری رگوں میں باؤلے پن کے

چمکتے شوخ سورج کو جگائے
میں پھٹی آنکھوں سے جلتے راز کو مڑکوں پہ عریاں ملوں

کتابیں میرا ایندھن ہیں
میں کتابوں میں سلگتی آگ ہوں

جلتا ہوا کاغذ
دھوئیں میں پھیلتی تصویر ہوں

میں ان کتابوں کا ارادہ ہوں
جسے تحریر کی خواہش دماغوں میں ہراساں ہے

ہراساں ہیں
کتابیں میری آنکھیں ہیں
مگر میں تو وہ کھلتا بند ہوتا چیختا در ہوں
جو کبھی سے کہکشاں کا منتظر ہے

''کیا تم نے ایک عورت کو دیکھا ہے''

.....زاہد ڈار.....

کیا تم نے ایک عورت کو دیکھا ہے
اس کی چھاتیوں کے درمیان ایک سانپ رینگ رہا ہے
اس کی رانوں کے درمیان سفید پانی کا چشمہ ہے
میں پیاس سے مر رہا ہوں
لیکن میں اسے ہاتھ نہیں لگا سکتا
میں ایک درخت کے اندر قید ہوں
کیا تم نے ایک عورت کو دیکھا ہے
میں اس کو دیکھ رہا ہوں
وہ ایک سانپ کو کھا گئی ہے
میری خواہشیں اس کے پیٹ میں ہیں
اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے
لوگ تالیاں بجا رہے ہیں
یہ تماشا ازل سے جاری ہے
میں انتظار کر رہا ہوں
جاؤ اسے ڈھونڈ کر لاؤ
موت میرے لیے نئی نہیں ہے
میں ہمیشہ مرتا رہا ہوں
لیکن میری زندگی ختم نہیں ہوئی
میری خواہشیں اس کے اندر رقص کر رہی ہیں
جاؤ مجھے ڈھونڈ کر لاؤ
درخت کے پتے گر رہے ہیں
ہوا چیخ رہی ہے
میں نے ایک عورت کو آسمان پر اڑتے ہوئے دیکھا ہے
کیا تم نے بھی کچھ دیکھا ہے
اگر تمہیں کچھ دکھائی دے تو مجھے بھی دکھانا
فی الحال تم خاموش رہو
تمہاری باتیں ریگستان کو سیراب نہیں کر سکتیں
خشک ریت میری پیاس نہیں بجھا سکتی
اس کی رانوں کے درمیان سفید پانی کا چشمہ ہے
سورج میرے سر کے اندر چمک رہا ہے
پاگل پن رقص کر رہا ہے
بادلوں نے اسے گھیر لیا ہے
میں محبت کے خواب دیکھ رہا ہوں
میں ایک واہمے کی آرزو میں مرتا ہوں
کیا تم نے اسے دیکھا ہے

.....

''میں ستاروں اور درختوں کی خاموشی کو سمجھ سکتا ہوں''

.....زاہد ڈار.....

میں ستاروں اور درختوں کی خاموشی کو سمجھ سکتا ہوں
میں انسانوں کی باتیں سمجھنے سے قاصر ہوں
میں انسانوں سے نفرت نہیں کرتا
میں ایک عورت سے محبت کرتا ہوں
میں دنیا کے راستوں پر چلنے سے معذور ہوں
میں اکیلا ہوں
میں لوگوں میں شامل ہونا نہیں چاہتا
میں آزاد رہنا چاہتا ہوں
میں خوش رہنا چاہتا ہوں
میں محبت کے بغیر خوش نہیں رہ سکتا
میں ایک عورت کی محبت کا بھوکا ہوں
میں ایک عورت کی محبت نہیں پا سکا
میں تنہائی سے نکلنے کا راستہ نہیں پا سکا
میں دکھ میں مبتلا ہوں
میں ایک عورت کو سمجھنے سے قاصر ہوں
میں خاموشی کی آوازوں کو سمجھ سکتا ہوں

☆☆☆☆☆

مختار صدیقی: اردو نعت کا اوّلیں تنقید نگار

اردو شاعری کے ابتدائی دور میں نعت صرف دواوین کی تکمیل میں تبرک کے طور پر کہی جاتی رہی۔ ولی دکنی ہو یا میر تقی میر، سودا ہو یا آتش و ناسخ کا زمانہ شاعری، یہاں تک کہ انیسویں صدی میں اردو کے سب سے بڑے شاعر مرزا غالب کے ہاں بھی نعت کی روایت محض حصولِ برکت کے طور پر نظر آتی ہے۔ فارسی شاعری، جس سے اردو شاعری نے اپنے تخلیقی تار و پود استوار کیے، اسی روایت کی حامل تھی، چناں چہ فردوسی طوسی سے لے کر مولانا عبدالرحمٰن جامی سے پہلے نظامی گنجوی تک، یہاں تک کے بعد کے شعرا نے بھی نعت کہنے کی اس روایت کو اسی محدود تناظر میں جاری رکھا بلکہ جامی کے ہاں بھی اسی روایت کا سلسلہ دواوینِ شاعری کی تکمیل کی حد تک رہا، تاہم جامی نے فارسی نعت کی روایت کو یوں آگے بڑھایا کہ اپنی مثنویات میں حمد و نعت کی ابتدا کے علاوہ اپنے دیوان میں مختلف ردیفوں کے تحت بہت سی نعتیں کہیں اور فارسی نعتیہ شاعری میں ایک قابلِ احترام اور لائقِ تقلید روایت قائم کی۔ اسی طرح اردو شعرا نے بھی تبرک کے طور پر اپنی مثنویوں اور دواوین کا آغاز حمدیہ و نعتیہ اشعار سے کیا، تاہم اوّلیں دور کے اردو شعرا میں ہمیں مولود ناموں اور معراج ناموں کی بھی ایک درخشاں روایت ملتی ہے جس نے نعتیہ شاعری کو علمی و عوامی حلقوں میں فروغ دیا، لیکن اردو شعرا کے ہاں نعت کہنے کی روایت ہمیں انیسویں اور بیسویں صدی میں تسلسل کے ساتھ نظر آتی ہے بلکہ انیسوی صدی کے ربعِ ثالث کو اردو نعت کے اعتبار سے یہ امتیاز حاصل ہے کہ ادبی حیثیت کے ساتھ نام ور اساتذۂ سخن امیر مینائی اور محسن کاکوروی کی نعت نگاری سے اس روایت کو استحکام ملا۔ ان سے قبل مولوی غلام امام شہید، کرامت علی شہیدی اور چند ایک دوسرے شعرا اگرچہ نعتیہ شاعری میں اپنا تخلیقی اعتبار حاصل کر چکے تھے اور اردو کے ایمان افروز سلسلۂ نعت گوئی میں علمی و ادبی اعترافات کے ساتھ ایک شعری معیار قائم کر چکے تھے لیکن امیر مینائی اور محسن کاکوروی نے نعت کو پورے تخلیقی محاسن اور ادبی ترفع کے ساتھ اپنی زندگی کا مطمحِ نظر بنایا۔ امیر مینائی نے اگرچہ اردو غزل میں بھی

دادِ سخن دی اور اپنے شاعرانہ مقام کو غزل گو شعرا میں تسلیم کروایا، تاہم اُن کا دیوانِ نعت ''محامدِ خاتم النبیینؐ''، جس کی ایک اشاعت ''خیابانِ آفرینش'' کے نام سے بھی موجود ہے، اُن کی نعتیہ شاعری سے اُن کی ایمانی وابستگی کی آئینہ دار ہے، البتہ محسن کاکوروی کا یہ اختصاص حاصل ہے کہ انھوں نے صرف نعت کہی اور نعت ہی کو اپنی سرمایۂ زندگی قرار دیا:

سخن کو رتبہ ملا ہے مری زباں کے لیے
زباں ملی ہے مجھے نعت کے بیاں کے لیے

زیرِ نظر مقالہ دراصل محسن کاکوروی کی نعتیہ شاعری کا تنقیدی تجزیہ ہے جس میں پس منظر کے طور پر نعت گوئی کی تاریخ اور ارتقا کا ایک اجمالی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ یہ ممتاز شاعر و ادیب مختار صدیقی کے رشحاتِ قلم کا وہ حصہ ہے جو آج تک نظر سے اوجھل رہا۔ یہاں اس تعارف کی ضرورت نہیں رہتی کہ مختار صدیقی نہ صرف اپنی شعری تصنیفات کے اعتبار سے بلکہ ایک اہم اور مشاق نثر نگار کے طور پر بھی انفرادی حیثیت رکھتے تھے۔ اس مقالے کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ اُس دور میں لکھا گیا جب اردو نعت پر باقاعدہ کوئی کام سامنے نہیں آیا تھا۔ میرے علم کے مطابق اردو نعت پر اب تک جو کام سامنے آسکا ہے، اُس میں ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق کا تحقیقی مقالہ ہے جو انھوں نے ۱۹۵۵ء میں ناگپور یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حصول کے لیے لکھا تھا مگر اس کی اشاعت ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب ''اردو میں نعتیہ شاعری'' کی اشاعت کے بعد ۱۹۷۶ء میں عمل میں آئی۔ اسی دور میں ڈاکٹر طلحہ برق رضوی کی کتاب ''اردو کی نعتیہ شاعری'' بھارت سے اور پاکستان سے ڈاکٹر ریاض مجید کی کتاب ''اردو میں نعت گوئی'' اردو کے ابتدائی عہد سے عہدِ موجود تک نعت گو شعرا کے ایک وسیع تر تنقیدی تجزیہ و تعارف کے ساتھ ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی۔ اس دور میں نعتیہ شاعری پر مختلف حوالوں سے جو کام ہوا، اُن میں ادبی پرچوں کے نعت نمبروں کو بھی خصوصیت حاصل ہے، بالخصوص ماہنامہ ''شام و سحر'' کے چھ عدد نعت نمبروں کے بعد نعتیہ ادب پر مشتمل کئی اور رسائل کی صورت میں یہ سلسلۃ الذہب ادبی اعتبار سے عہدِ موجود کی نعتیہ شاعری تک موجود ہے اور تا حال متنوع تنقیدی موضوعات کے ساتھ اردو نعت پر مقالات اور کتابوں کی صورت میں لائقِ اعتبار کام نعتیہ شاعری کے فروغ میں اپنا نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔

تاہم مختار صدیقی کا یہ مقالہ، بالخصوص نعتیہ شاعری کی تاریخ و ارتقا کے جائزے کے حوالے سے اس وقت تحریر ہوا جب اس موضوع کی جانب ہمارے نقادانِ شعر و ادب متوجہ نہیں تھے بلکہ نعت اور نعت کے ضمن میں کچھ لکھنے پر اُن کے ذہن و فکر کا کوئی نرم گوشہ بھی تسلیم کرنے کو روادار نہ تھا، بلکہ ایک شنیدہ روایت کے مطابق یہ وہی دور تھا جب ایک موقر ادبی جریدہ کے مدیر کو اشاعت کے لیے ایک نعت موصول ہوئی تو انھوں نے یہ کہہ کر واپس لوٹا دی کہ اس کی اشاعت کے بعد مجھے بھجن بھی شائع کرنے پڑیں گے۔ اس دور میں

مختار صدیقی (مرحوم) نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور اردو نعت کے ارتقائی جائزے کے بعد دورِ متاخرین کے ایک بڑے نعت گو شاعر محسن کاکوروی کی نعتیہ شاعری اور محاسنِ شعری کا جائزہ لیا۔ اس مقالے کی مجموعی خصوصیات کو آج اگر عہدِ موجود تک لکھے گئے مقالات و کتب کے تناظر میں دیکھا جائے تو شاید اس کی اہمیت قدرے کم تر تصور کی جائے لیکن میرے خیال میں اردو نعتیہ ادب میں جہاں اسے زمانی اعتبار سے تقدم حاصل ہے، وہیں اِس کی اِس خصوصیت کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ یہ اردو شعر و ادب کے ایک ممتاز قلم کار کی تحریر ہے اور بہ ہر حوالہ ہمارے نعتیہ ادب میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

مقالے کے باب اول سے پہلے عربی میں نعت گوئی کے آغاز میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ کے موقع پر مدینے کی بچیوں کا استقبالی نغمہ ''طلع البدر علینا''، صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نمایاں اصحاب نعت بالخصوص کعبؓ بن زہیر، عبداللہ بن رواحہؓ کے نعتیہ اشعار اور پھر بوصیریؒ کے قصیدۂ بردہ کے نعتیہ اشعار کا جائزہ عربی متن اور اردو تراجم کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اسی طرح فارسی میں نعتیہ شاعری اور اس کے محرکات کو پیش کرتے ہوئے فارسی کے نمایاں نعت گو شعرا کی نعتوں کا تعینِ ادوار کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔

مقالے کا اصل موضوع محسن کاکوروی کی نعتیہ شاعری کا فکری و فنی تجزیہ ہے جس میں مختار صدیقی مرحوم نے محسن کاکوروی کی شخصیت و فن اور محاسنِ کلام کو تاریخی قدر کے ساتھ اجاگر کیا، اور بہ حیثیت ایک مسلمان صاحبِ قلم، علمی و ادبی تبحر کے ساتھ اپنے ایمانی جذبے کا بھی ثبوت دیا ہے۔ محسن کی شخصیت، زندگی اور محسن کے دورِ شاعری میں ماحول کا تعین کرتے ہوئے سیاسی و مذہبی رجحانات کا جائزہ اور اس حوالے سے ادبی پس منظر کو مجمل پیرائے میں بیان کر کے محسن کی ادبی زندگی اور تخلیقی معیار کو متوازن تنقیدی معیار کے زاویوں بلکہ پورے تنقیدی شعور کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ دلی، لکھنؤ، آگرہ اور گرد و نواح کے سیاسی و سماجی ماحول، شعر و ادب کی رنگینیاں، اصلاحِ زبان و ادب، ڈپٹی نذیر احمد کی اصلاحی تحریک کا جائزہ، ادبی ماحول، محسن کی شاعری پر اس ماحول کے اثرات اور نئی ادبی تحریکوں کے آئینے میں محسن کی شاعری کا فکری و تخلیقی پہلو اس مقالے کی اہمیت میں مستزاد ہے۔

مختار صدیقی نے محسن کے محاسنِ کلام کے جائزہ سے قبل کلامِ محسن کا تاریخی گوشوارہ بھی مرتب کیا اور صنفی اعتبار سے یعنی محسن کی نعتیہ مثنویات، نعتیہ غزلیں، نعتیہ قصاید اور نعتیہ رباعیات کے توصیفی پہلوؤں کو محسن کی فنی خصوصیات کے ساتھ دیکھا ہے۔ پھر انتہائی احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے سنین کا اندراج کیا گیا ہے۔ یہ اس لیے بھی ممکن ہوا کہ محسن کے کلیات نعت میں کم و

بیش ہر تخلیق پر تاریخ کا اندراج موجود ہے، تاہم ایک تاریخی گوشوارے کے طور پر یہ اندراج قاری کو ایک ترتیب کے ساتھ ایک ہی جگہ میسر آ جاتا ہے جس سے زمانی اعتبار سے نعت میں محسن کے تخلیقی ارتقا کا اندازہ کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی۔

محسن کاکوروی اپنے قصیدۂ نعت ''مدیح خیر المرسلینؐ''، مثنوی ''چراغ کعبہ'' اور ''صبحِ تجلی'' جیسی تخلیقات کے باعث اردو نعت میں ایک منفرد و ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، مگر اُن کی شہرت کا آغاز ان کے قصیدۂ نعت سے ہوا، جس کی تشبیب کے اس پہلے شعر ہی نے اہلِ ذوق کو اپنی جانب متوجہ کر لیا:

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لائی ہے صبا گنگا جل

.....

اپنی تشبیہات کی ندرت، ہندی تلمیحات و استعارات کی فراوانی اور نکتہ آفرینی نے نعتیہ قصیدے کی تشبیب میں ایسا رنگ دکھایا جو محسن کی بلندیِ تخیل کا ایک اچھوتا اور دل کش آئینہ ہی نہیں بلکہ اردو قصیدہ نگاری میں اُن کی جدت آہنگ کا پہلو بھی رکھتا ہے۔ ہندی تلمیحات اور ندرت لفظی کے ساتھ جو روانی اور نغمگی اس قصیدے میں موجود ہے، وہ نعتیہ قصاید ہی نہیں بلکہ اردو قصیدہ نگاری میں بھی ایک نئے اور خوش آہنگ اسلوب کو متعارف کرواتا ہے۔ مختار صدیقی نے اس قصیدے کے فکری و فنی معیار پر لکھتے ہوئے اُن کی نکتہ آفرینی، تہذیبی متانت، تخلیقی انفرادیت اور بہت سے اہم پہلوؤں کا تجزیہ کیا ہے اور صنائع معنوی کے آئینے میں بھی اُن کے کلام کی فنی خوبیوں کو اجاگر کرنے میں اپنے تنقیدی و فنی شعور کا ثبوت دیا ہے۔ اسی طرح ان کی نعتیہ مثنویات کے فکری و فنی پہلوؤں کے ساتھ محسن کی حقیقت پسندی، زبان و بیان کی خصوصیات، مثنویات میں بیان کیے گئے واقعات کا حقیقت و واقعیت کے ساتھ گہرے تعلق، ڈرامائی امتزاج کی کیفیات اور اشعار میں موجود تاثر آفرینی کی منفرد مثالوں کو پیش کرتے ہوئے اپنی بلند فکری کا ثبوت دیا ہے۔ یوں محسن کی نعتیہ غزلیات، مسدس اور رباعیات کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے مختار صدیقی نے فنی اعتبار سے محسن کے تلازماتِ شعری کو گہرے تنقیدی شعور کے ساتھ بیان کیا ہے، اور ان سب پر مستزاد یہ کہ جہاں محسن کاکوروی نے اپنی نعتیہ اصناف میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی ایمانی محبت، والہیت اور گہری وابستگی کا ثبوت دیا ہے وہیں مختار صدیقی کے اس مجموعی جائزے میں بھی پورے ایک سچے مسلمان قلم کار کے صدق دل کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

☆☆☆☆☆

خالد علیم

ڈاکٹر اسلم انصاری رخصت ہو گئے [اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْن]

گوتم کا آخری وعظ

(اسلم انصاری)

مرے عزیزو،
مجھے محبت سے تکنے والو،
مجھے عقیدت سے سننے والو،
مرے شکستہ حروف سے اپنے من کی دنیا
بسانے والو،
مرے الم آفریں تکلم سے انبساط تمام کی
لازوال شمعیں جلانے والو،
بدن کو تحلیل کرنے والی ریاضتوں پر
عبور پائے ہوئے، سکھوں کو تجے ہوئے
بے مثال لوگو،
حیات کی رمزِ آخریں کو سمجھنے والو — عزیز
بچو — میں بجھ رہا ہوں
مرے عزیزو، میں جل چکا ہوں
مرے شعورِ حیات کا شعلۂ جہاں تاب
بجھنے والا ہے
میرے کرموں کی آخری موج میری
سانسوں میں گھل چکی ہے
میں اپنے ہونے کی آخری حد پہ آ گیا ہوں
— تو سن رہے ہو، مرے عزیزو، میں جا رہا ہوں
میں اپنے ہونے کا داغ آخر کو دھو چلا ہوں
کہ جتنا رونا تھا، رو چلا ہوں
مجھے نہ اب ذات کی خبر ہے، نہ اب کسی چیز پر نظر ہے
میں اب تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ نیستی
کے، سکوت کامل کے،
جہلِ مطلق — (کہ علمِ مطلق ہے) —
جہلِ مطلق کے
بحرِ بے موج سے ملوں گا تو انت ہوگا
اس التباسِ حیات کا، جو تمام دکھ ہے!
میں دکھ اٹھا کر — مرے عزیزو — میں دکھ اٹھا کر
حیات کی رمزِ آخریں کو سمجھ گیا ہوں: تمام دکھ ہے
وجود دکھ ہے، وجود کی یہ نمود دکھ ہے
حیات دکھ ہے، ممات دکھ ہے

ظفر معین بلے جعفری

یہ ساری موہوم و بے نشاں کائنات دکھ ہے
شعور کیا ہے؟ اک التزامِ وجود ہے، اور وجود کا التزام دکھ ہے
جدائی تو خیر آپ دکھ ہے، ملاپ دکھ ہے
کہ ملنے والے جدائی کی رات میں ملے ہیں، یہ رات دکھ ہے
یہ زندہ رہنے کا، باقی رہنے کا شوق، یہ اہتمام دکھ ہے
سکوت دکھ ہے، کہ اس کے کربِ عظیم کو کون سہہ سکا ہے
کلام دکھ ہے، کہ کون دنیا میں کہہ سکا ہے جو ماورائے کلام دکھ ہے
یہ ہونا دکھ ہے، نہ ہونا دکھ ہے، ثبات دکھ ہے، دوام دکھ ہے
مرے عزیزو، تمام دکھ ہے!

....

ڈاکٹر اسلم انصاری عصرِ حاضر کے ایک ممتاز محقق اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ والد گرامی قبلہ سید فخر الدین بلے اور ڈاکٹر اسلم انصاری کی تعلق داری، دوستانہ روابط اور مراسم بلکہ رفاقت کا سلسلہ کب اور کیسے شروع ہوا اس حوالے سے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے البتہ پورے وثوق سے ضرور کہہ سکتے ہیں کہ آنکھ کھولنے کے بعد سے ہم پروفیسر ڈاکٹر اسلم انصاری صاحب کو گھر کے ایک بڑے اور ایک فرد اور اپنے والد گرامی کے مقرب، برادر اور دوست کے طور پر دیکھتے آرہے ہیں۔

جب ہمارے والد گرامی قبلہ سید فخر الدین بلے شاہ صاحب محکمہ اطلاعات و نشریات، تعلقات عامہ، ثقافت و سیاحت ملتان اور بعد ازاں ملتان اور بہاول پور کے بیک وقت ڈویژنل ہیڈ تھے۔ اس وقت انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ملتان کا دفتر حسن پروانہ روڈ ملتان پر واقع تھا۔ (یہ ذوالفقار علی بھٹو کا دور تھا) عمارت کا فرنٹ پورشن دفتر اور بیک پورشن اقامت گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

گو کہ ہماری عمر بہت کم تھی ابھی ٹھیک سے بولنا اور چلنا پھرنا بھی نہیں آتا تھا لیکن دھندلا دھندلا یاد ہے مسعود اشعر۔ حاجی کھوکھر۔ اقبال ساغر صدیقی۔ ڈاکٹر مقصود زاہدی۔ جناب اسلم انصاری صاحب اور دیگر بہت سے اصحاب اکثر ہمارے والد گرامی کے پاس آیا کرتے تھے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ عمارت کے فرنٹ پورشن میں مین گیٹ سے متصل حصے کو صاف ستھرا اور پینٹ کروایا گیا۔ ایک طرح سے سنوارا ہوا نظر آرہا تھا لیکن بنا کسی دیوار کیے۔ پھر عمارت کے اس سنوارے جانے والے حصے پر ملتان آرٹس کونسل کا بورڈ نصب ہوگیا اور جب ہم نے دفتر کے اندر جاکر دیکھا تو جناب اسلم انصاری صاحب ڈویژنل سربراہ آرٹس کونسل کی کرسی پر براجمان تھے۔ اور پھر انھوں نے ہمیں خوش آمدید کہا اور اپنی ایگزیکٹو کی نشست پر ہمیں اٹھا کر بٹھا دیا۔

ہمیں اچھی طرح سے یاد ہے کہ اس وقت کے اسپیکر قومی اسمبلی صاحبزادہ فاروق علی اور مسعود اشعر صاحب والد گرامی کے پاس آبیٹھے تھے کہ اچانک بڑے بھیا سید انجم معین بلے صاحب وارد ہوئے اور فرمایا کہ فیض انکل (فیض احمد فیض صاحب) تشریف لائے ہیں۔ یہ سنتے ہی تمام اصحاب کے چہرے کھل اٹھے اور سب کے سب فیض کا استقبال کرنے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسلم انصاری صاحب کو بھی مطلع کیا گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بادشاہ سلامت کی تشریف آوری ہو رہی ہے۔ ایسے ان

گت واقعات ہیں جنہیں ہمارے بچپن کے یادگار واقعات کا نام دیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر اسلم انصاری صاحب کی محبتوں، قربتوں، شفقتوں اور قرابت داری میں بچپن سے لے کر اب تک کا عرصہ بلکہ اب کی تمام تر عمر کو ہماری زندگی کا حسین ترین وقت گردانا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ پروفیسر ڈاکٹر اسلم انصاری صاحب کو ہم اکثر والدگرامی قبلہ سید فخرالدین بلے شاہ صاحب سے محو گفتگو دیکھا کرتے تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر اسلم انصاری صاحب کے تحقیقی اور تنقیدی مقالات بھی اکثر و بیشتر سننے کا اعزاز حاصل ہوتا تھا۔ سات صدیوں بعد۔ رنگ۔ سید فخرالدین بلے کا تخلیقی معجزہ بھی میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر اسلم انصاری صاحب کی اسی عہد کی یادگار تحریروں میں سے ایک ہے۔

جب بابا جانی قبلہ سید فخرالدین بلے شاہ صاحب نے ملتان آرٹس میں سربراہ کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد جشن تمثیل انیس سو بیاسی کا دھماکہ کیا تو تھیٹر کی دنیا اور تاریخ میں اس پچیس روزہ جشن تمثیل کو بھی ایک تاریخی، انوکھا اور فقید المثال کارنامہ قرار دیا گیا۔ پچیس روزہ جشن تمثیل انیس بیاسی میں بھی بابا جانی قبلہ سید فخرالدین بلے شاہ صاحب کی ڈھارس بندھانے اور حوصلہ افزائی کرنے والوں میں پروفیسر ڈاکٹر اسلم انصاری صاحب پیش پیش تھے۔

حیرت سے جو یوں میری طرف دیکھ رہے ہو
لگتا ہے کبھی تم نے سمندر نہیں دیکھا

عجب انداز سے یہ گھر گرا ہے
مرا ملبہ مرے اوپر گرا ہے

میری قامت سے ڈر نہ جائیں لوگ
میں ہوں سورج مجھے دیا لکھنا

....

جیسے چونکا دینے والے لہجے کے اشعار کے خالق بڑے بھیا جناب آنس معین کی المناک جواں مرگی پر ہم نے تمام ہی قرابت داروں کو اپنے اور سید فخرالدین بلے فیملی کی طرح دکھی اور غمگین دیکھا ان حد درجہ افسردہ اور غمگین لوگوں میں پروفیسر ڈاکٹر اسلم انصاری صاحب بھی شامل تھے۔ گزشتہ دنوں پروفیسر ڈاکٹر اسلم انصاری صاحب کا مقالہ۔ آنس معین ایک لافانی اور صاحب طرز شاعر آنس معین ایک عبقری، ایک شعلہ، تخلیق--- ایک مدت کے بعد پڑھنے کا اتفاق ہوا تو تو ہم دیر تک اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکے۔

ہم نے اپنے والد گرامی قبلہ سید فخرالدین بلے شاہ صاحب کے ساتھ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کی۔ لیکن والد گرامی کے کے حلقہ احباب میں شامل تمام تر احباب سے تمام تر محبان اور رفقاء سے ہمارا رابطہ مسلسل برقرار رہا۔ ملتان سے ایک مرتبہ بھی ہم لوگ والد گرامی کی ملازمت کے باعث ایک مرتبہ پھر لاہور منتقل ہو گئے۔ لاہور میں بھی والد گرامی کی ادبی تنظیم کا قافلہ رواں دواں رہا اور قافلے کے پڑاؤ بھی مسلسل ہوتے رہے اور قبلہ سید فخرالدین بلے شاہ صاحب نے ادبی رسالہ ہفت روزہ آواز جرس۔ لاہور کی اشاعت اشاعت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ آواز جرس کو پہلے شمارے سے ہی جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کا بھی قلمی تعاون حاصل رہا تھا۔ اور آواز جرس میں دنیائے شعروادب کی تمام ہی نامور شخصیات کی تخلیقات مسلسل اشاعت پذیر ہوا کرتی

تھیں۔ پروفیسر ڈاکٹر اسلم انصاری صاحب کی تخلیقات بھی نہایت اہتمام کے ساتھ شامل اشاعت کی جاتی رہیں۔

جب حضرت احمد ندیم قاسمی صاحب کے پچھتر سالہ جشن کا اہتمام کیا گیا تو ملک بھر سے بلکہ بیرون ممالک سے بھی متعدد اور نامور شخصیات نے شرکت کی۔ ہمارے محترم مشتاق احمد یوسفی صاحب کراچی سے اور ڈاکٹر اسلم انصاری صاحب بھی ملتان سے تشریف لائے تھے۔ اواری ہوٹل کا ہال مہمانان گرامی سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر اسلم انصاری صاحب ہماری ساتھ والی نشست پر براجمان تھے۔ ہم نے ان سے گزارش کی کہ آپ ہمارے ساتھ ہی بلے ہاؤس چلیے اور وہیں پر آپ کا قیام بھی رہے گا۔ جناب اسلم انصاری صاحب کو ہم نے بتایا کہ والد گرامی اس تقریب میں طبیعت کی خرابی کے باعث شرکت نہ فرما سکے۔ قصہ مختصر ہم نے اسلم انصاری صاحب کے ساتھ آئے ہوئے صاحب شاید ان کا اسم شریف پروفیسر آفتاب تھا سے ان کے گھر کا مکمل پتہ اور فون نمبر دریافت کیا اور نوٹ کیا۔ تقریب کا اختتام ہوا۔ سب اپنے اپنے گھروں کی اور روانہ ہو گئے۔ ہم جب اپنے گھر پہنچے اور والد گرامی قبلہ سید فخر الدین بلے شاہ صاحب کو تقریب کے احوال سے آگاہ کیا۔ اور اسلم انصاری صاحب کی بابت بھی مطلع کیا۔ تو انھوں نے لمحہ بھر کی تاخیر بنا ہمیں حکم دیا کہ میری ان سے فون پر بات کروا دیجیے اور بس پھر کیا ہوا یہ نہ پوچھیں۔ ہم اس فون کال کے ختم ہوتے ہی اسلم انصاری صاحب کو لینے کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد وہ جتنے بھی دن رہے ان کا قیام بلے ہاؤس میں ہی رہا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اگلے ہمارے والد گرامی سید فخر الدین بلے صاحب اور ڈاکٹر اسلم انصاری صاحب کے بہت سے مشترکہ دوستوں میں سے ایک ہمارے نہایت شفیق بزرگ حضرت ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ خوب بیٹھک جمی دھواں دھار گفتگو کے دور چلے۔

رباعی..... پروفیسر ڈاکٹر اسلم انصاری

تاریخ کے دھارے پہ بہے گی دنیا
جو کہتی ہے وہ کہتی رہے گی دنیا
تم لاکھ جتن اس کے بدلنے کے کرو
جیسی ہے اسی طرح رہے گی دنیا

.....

اب ایک سرسری سی نظر ڈالتے ہیں پروفیسر ڈاکٹر اسلم انصاری صاحب کے چند شعری مجموعوں اور چند دیگر تحقیقی اور تنقیدی تصانیف پر مشتمل اس فہرست پر کہ جس کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

خواب و آگہی (شاعری)
نقش عہد وصال کا (کلام)
شب عشق کا ستارہ (کلام)
ارمغان پاک
(جدوجہد آزادی کی منظوم داستان)
فیضان اقبال (منظوم اقبالیات)
اقبال عہد آفرین
مطالعات اقبال
شعر و فکر اقبال
اردو شاعری میں المیہ تصورات
ادبیات عالم میں سیر افلاک کی روایت
تکلمات
زندگی کا فکری اور فنی مطالعہ
بیڑی وچ دریا (ناول)
نگار خاطر

چراغ لالہ
جسے میر کہتے ہیں صاحبو
غالب کا جہان معنی
مکالمات
فکر و انتقاد

پروفیسر ڈاکٹر اسلم انصاری کو 2009 میں تمغہ امتیاز سے نوازا گیا تھا اور اب سے لگ بھگ پانچ چھ برس قبل کا قصہ ہے کہ خانہ فرہنگ اسلامی جمہوریہ ایران ملتان میں معروف دانشور اور شاعر ڈاکٹر اسلم انصاری کی فارسی زبان میں تصنیف ''دیوان کامل'' کی تقریب رونمائی کا انعقاد کیا گیا، تقریب میں خصوصی طور پر اسلامی جمہوریہ ایران کے پاکستانی میں تعینات کلچر قونصلر آغا شہاب الدین درانی نے شرکت کی، تقریب میں معروف دانشور اور ادیب ڈاکٹر اسد اریب، شاکر حسین شاکر، علامہ سید مجاہد عباس گردیزی اور دیگر نے شرکت کی، تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر اسد اریب کا کہنا تھا کہ شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ اقبال کے بعد ڈاکٹر اسلم انصاری پاک و ہند کی وہ دوسری شخصیت ہیں جن کے فارسی ادب سے اہالیان فارس مستفید ہوئے اور ان کے نام سے ایران کی یونیورسٹی میں ایک چیئر مخصوص ہے، تقریب سے صدارتی خطاب کرتے ہوئے کلچر قونصلر شہاب الدین درانی نے کہا کہ ڈاکٹر اسلم انصاری دنیائے فارسی ادب کا درخشاں ستارہ ہیں، اہالیان ملتان صرف بہاؤالدین زکریا اور شاہ شمس سبزواری پر فخر نہ کریں بلکہ گمنام زندگی بسر کرنے والے ڈاکٹر اسلم انصاری جیسی شخصیت پر بھی فخر کریں، جن کا فلسفہ، تقابل ادیان اور فارسی ادب پر بڑا کام ہے، اُنھوں نے کہا کہ پاکستانیوں کو بالعموم اور اہالیان ملتان کو بالخصوص ان کا احترام کرنا چاہیے، ان کے علم سے استفادہ حاصل کرنا چاہیے اور اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے، ان جیسے عظیم افراد کے وجود کو غنیمت اور باعث رحمت سمجھنا چاہیے۔ بعدازاں ڈاکٹر اسلم انصاری نے کلچر قونصلر شہاب الدین درانی کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی توجہ اور خانہ فرہنگ ایران ملتان کی ناظمہ خانم زاہدہ بخاری کی کاوشوں سے بالآخر کتاب کی اشاعت کا کام انجام پذیر ہوا۔
اور 2020 کو ڈاکٹر اسلم انصاری صدارتی تمغہ حسن کارکردگی عطا کیا گیا۔ اور ماہ رواں گویا کہ اپریل 2022 میں پروفیسر ڈاکٹر اسد اریب صاحب اور پروفیسر ڈاکٹر اسلم انصاری صاحب کے گھروں کے باہر ملتان کی انتظامیہ یعنی کہ ڈپٹی کمشنر صاحب نے اپنی ٹیم اور مقامی شعرا اور ادبا اور صحافیوں کے ہمراہ حکومت پنجاب کی جانب سے عصر حاضر کے مقتدر سکالر محقق اور شاعر کے نام کا پتھر نصب کیا کہ جس پر پروفیسر ڈاکٹر اسد اریب اور پروفیسر ڈاکٹر اسلم انصاری صاحب کے اسمائے مبارک تاریخ ولادت اور خدمات کا ذکر کندہ کیا گیا ہے۔ گویا کہ ڈپٹی کمشنر ملتان جناب عامر کریم خان صاحب نے محسنین ملک وملت اور شعر وادب کی برگزیدہ ہستیوں کی خدمات کا برملا اعلان کر کے دراصل ان کے کمال فن کا اعتراف کیا ہے اور یہ حد درجہ احسن اقدام ہے اس کو سراہے جانے کی ضرورت ہے:

میں نے روکا بھی نہیں اور وہ ٹھہرا بھی نہیں

☆☆☆☆☆

مذہب اور مارکسزم

طاہر شبیر

کارل مارکس نے ''داس کیپٹل'' کے شروع میں ایک فقرہ لکھا "The Religion is Opium" جس کا مطلب تھا ''مذہب نشہ ہے۔'' سامراجی طاقتوں نے اس کا فائدہ اٹھایا اور ہر مذہب کے ماننے والوں کو مارکسزم کے مقابلے پر کھڑا کر دیا۔ سامراج نے دُنیا کو پیغام دیا کہ مارکسزم ایک نیا نظریہ ہے جو دُنیا میں پہلے سے موجود تمام مذاہب کا مخالف ہے اور دنیا کے کسی مذہب کو نہیں مانتا۔ مزید یہ کہ مارکسزم کو ماننے والے دہریئے (Atheist) ہیں اور وہ خدا کے وجود سے ہی منکر ہیں۔

ہر مذہب کے انتہا پسند ہی نہیں بلکہ اعتدال پسند لوگ بھی سامراج کے اس جال میں پھنس گئے اور مارکسزم کے خلاف سرد جنگ شروع کر دی۔ ہمارے ملک پاکستان میں مُلّاں ہی نہیں بلکہ پڑھے لکھے اور ترقی پسند لوگ بھی مارکسزم (سوشلزم + کمیونزم) کے ماننے والوں کو دہریہ ہی سمجھتے رہے اور آج بھی لوگوں کی اکثریت اس غلط فہمی کا شکار ہے۔

پاکستان کے مشہور مارکسسٹ رہنما میجر اسحاق جنھوں نے وکالت کا امتحان پاس کر لیا تھا اور کامریڈ ''حسن ناصر شہید''

کے مقدمۂ قتل میں میاں محمود علی قصوری کے معاون وکیل تھے - مقدمے کی کارروائی کے دوران جب سرکاری وکیل نے کہا کہ حسن ناصر ایک زہری کمیونسٹ تھا اور میجر اسحاق اُس کا دوست تھا تو میجر اسحاق نے جج کو مخاطب کر کے کہا کہ سرکاری وکیل معاملے کو سیاسی رنگ دینے کی کوشش کر رہا ہے۔

حسن ناصر کو 13 نومبر 1960 کو شاہی قلعہ لاہور میں اُن کی انقلابی سرگرمیوں کی وجہ سے پنجاب پولیس نے تشدد کر کے قتل کر دیا تھا اور اُس کی لاش بھی آج تک لواحقین کو نہ مل سکی۔

میجر اسحاق نے لاہور ہائی کورٹ میں اس مقدمے کی پیروی کی۔ میجر اسحاق نے جس دلیری سے اس مقدمے کی پیروی کی اسی دلیری سے اُنھیں اپنے کمیونسٹ ہونے پر فخر کا اظہار کرنا چاہیے تھا۔

مشہور ترقی پسند شاعر اور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی صاحب کو جب باقاعدہ کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی تو قاسمی صاحب نے سجاد ظہیر کو ایک طویل خط میں لکھا کہ:

''میں خدا کی وحدانیت اور اُس کے رسولؐ پاک کی نبوت پر ایمان رکھتا ہوں اس لیے میں کمیونسٹ کیسے ہو سکتا ہوں۔ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے منشور کا پابند ہوں کمیونسٹ مینی فیسٹو کا نہیں۔''

یہ وہی احمد ندیم قاسمی صاحب تھے جو انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کے جنرل سیکرٹری تھے اور انجمن کے 1949 کے اجلاس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا منشور پڑھتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ

''ہم ادب برائے زندگی، ادب برائے جدوجہد ادب برائے انقلاب کے نظریے کو اپنا سنگِ بنیاد خیال کرتے ہیں۔''

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح لوگ مارکسزم کے بارے میں خود بھی گمراہ تھے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے رہے۔

کچھ لوگوں نے مالی مفادات اور حکومتی عہدے حاصل کرنے کے لیے جان بوجھ کر بھی ایسا کیا۔

اس طرح سامراج نے انتہا پسند مذہبی لوگوں کو ہی نہیں بلکہ نام نہاد ترقی پسندوں کو بھی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا اور انقلابی تحریکوں کو ناکام کرنے کے لیے اُنہی تحریکوں کے اندر سے غدار پیدا کیے۔

یہاں ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ مارکسزم کوئی مذہب نہیں ہے بلکہ یہ ایک اصلاحی اور انقلابی معاشی نظام ہے جو سرمایہ دار کی لوٹ مار کو ختم کر کے مزدور کو اُس کا حق دلانے کی بات کرتا ہے، مارکسزم طبقات کو ختم کرنے کی بات کرتا ہے - ذرائع پیداوار جس میں زمین،

معدنیات، کارخانے، فیکٹریاں اور بینک شامل ہیں اُن پر کسی سرمایہ دار طبقے کی ملکیت کو ختم کرنے کی بات کرتا ہے اور ذرائع پیداوار کے تمام انسانوں کی مشترکہ ملکیت ہونے کی بات کرتا ہے۔

مارکسزم کسی انسان کے مذہبی عقائد کو تبدیل کرنے کی بات نہیں کرتا کیونکہ مذہب انسان کا ذاتی فعل ہے۔ مارکسزم کے ماننے والے چاہے کوئی بھی مذہب اختیار کریں یہ اُن کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا۔

کارل مارکس نے اگر کہا تھا کہ "The Religion is Opium" یا ''مذہب نشہ ہے'' تو کوئی غلط بات نہیں کی تھی کیونکہ ہر مذہب کے ٹھیکیداروں اور مفاد پرست مُلاؤں نے دین کو ایک نشہ بنا دیا ہے۔ وہ لوگوں کو یہی تعلیم دیتے ہیں کہ اُن کی غربت اور بدقسمتی خدا کی طرف سے ہے۔ اس میں موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس لیے وہ اپنی غربت اور بدقسمتی کو خدا کی رضا سمجھ کر قبول کریں اور اپنے دل میں سرمایہ داروں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے کی سوچ نہ پیدا ہونے دیں۔

آیئے اب ہم دنیا کے مختلف مذاہب کے معاشی نظام اور انسان دوستی کا مارکسزم سے موازنہ کرتے ہیں۔ اس سے پہلے ہمیں واضح کرنا ہے کہ مارکسزم (سوشلزم اور کمیونزم) کیا ہے۔

سوشلزم (Socialism)

سائنسی سوشلزم سے مراد وہ سماجی نظام ہے جس میں پیداوار کے تمام ذرائع زمین، معدنیات، کارخانے، فیکٹریاں، بینک، تجارت وغیرہ معاشرے کی مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں اور ان کی پیداوار جسمانی اور ذہنی کام کرنے والوں کی تخلیقی محنت کے مطابق تقسیم کی جاتی ہے یعنی جو شخص جس قدر محنت کرتا ہے اُسے اُس کے مطابق معاوضہ دیا جاتا ہے کہ اُس کے سماجی مرتبے کے مطابق۔

کمیونزم (Communism)

کمیونزم، سوشلزم کا اگلا قدم ہے اس سے مُراد وہ اشتراکی نظام ہے، جس میں پیداواری قوتیں اور پیداوار دونوں اتنی بڑھ جاتی ہیں کہ اشیائے صرف کے استعمال کا پیمانہ افراد کی محنت نہیں ہوتا بلکہ اُن کی ضرورت ہوتا ہے۔ کمیونزم وہ نظام حکومت ہے جس میں ریاست کے ہر شہری کی تعلیم، صحت، روٹی، کپڑا اور مکان کی ضرورتیں پوری کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے چاہے وہ محنت کم کرے یا زیادہ۔

کارل مارکس نے کہا ہے کہ کمیونسٹ سماج کا اعلیٰ مرحلہ یہ ہے کہ سماج اس قابل ہو جائے کہ اپنے پرچم پر لکھ سکے۔

''ہر ایک سے اُس کی قابلیت کے مطابق اور

ایک کو اُس کی ضرورت کے مطابق۔''

دنیا کا ہر مذہب غریبوں کے حقوق کی بات کرتا ہے اور ظالموں یا سرمایہ داروں کی مخالفت کرتا ہے۔ دُنیا کے کسی مذہب نے طبقات کی حمایت نہیں کی سوائے ہندو مذہب کے۔ ہندو مذہب میں بھی لگتا ہے کہ یہ طبقات مذہب نہیں بلکہ سماج نے پیدا کیے ہیں۔ دنیا کا ہر مذہب طبقات کو ختم کرتے اور انسانیت کی بھلائی کی بات کرتا ہے نہ کہ لوگوں کو غلام بنانے اور اُن کا استحصال کرنے کی۔

کارل مارکس سے پہلے بھی کمیونزم کا نظریہ موجود تھا یونان اور دوسری پرانی تہذیبوں میں کمیونزم کا نظریہ موجود تھا اور قدیم تاریخ میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ یونان میں افلاطون نے اشتراکیت کا نظریہ پیش کیا۔

افلاطون کا نظریۂ اشتراکیت

آج سے اڑھائی ہزار برس قبل افلاطون نے یونانی میں اشتراکیت کا جو نظریہ پیش کیا تھا وہ کچھ اس طرح ہے کہ

حکومت پر بہترین افراد کی حکمرانی ہونی چاہیے۔ ان حکام کی دیانت داری کو یقینی بنانے کے لیے افلاطو فان کی تجویز ہے کہ اُن کو نجی جائیداد رکھنے کا حق نہیں ہونا چاہیے۔ اُن کی ہر شے مشترکہ ہونی چاہیے۔ وہ کھانے کے مشترکہ کمروں میں کھانا کھایا کریں اور اکٹھے ہی بیرکوں میں سویا کریں ذاتی مفادات نہ ہونے کے سبب یہ حکمران بدعنوانی سے پاک ہو جائیں گے اور اُن کی بس ایک ہی لگن ہو گی وہ یہ کہ انسانوں کے درمیان انصاف قائم کرنا اور اُس کو برقرار رکھنا۔

افلاطون کہتا ہے کہ شہریوں کو چاہیے کہ زمین اور مکان فوراً سب میں تقسیم کریں اور مشترکہ طور پر کاشت کریں لیکن جن لوگوں کو یہ زمینیں ملیں ان کو لازم ہے کہ وہ یہ سمجھیں کہ یہ قطعات پورے شہر کی ملکیت ہیں۔ اراضی کی یہ تقسیم حتی الامکان مساوی ہونی چاہیے۔ سونے چاندی کا استعمال ممنوع ہونا چاہیے اور سکّے اتنے ہی ڈھالے جائیں جتنے روزانہ کے تبادلے کے لیے ضروری ہوں۔

ہندومت بدھ مت اور اشتراکیت

ہندومت دنیا کا قدیم مذہب ہے جو انسانوں کو چار طبقات میں تقسیم کرتا ہے۔

(1) برہمن کا کام مذہبی رسومات کی ادائیگی اور پوجا پاٹ سے متعلق امور کی انجام دہی ہے۔

(2) کھشتری راج پاٹ کو سنبھالتے ہی اور سپاہی سے لے کر راجہ تک جنگ و جدل اور حکمرانی کے تمام فرائض کھشتری انجام دیتے ہیں۔

(3) ویش طبقے کا تعلق کھیتی باڑی اور زمینوں کی دیکھ بھال سے ہوتا ہے۔

(4) شودر ہندو مذہب کا وہ طبقہ ہے جو نیچ

ذات سمجھا جاتا ہے اور اس کا کام اعلیٰ طبقات کی خدمت کرنا ہے۔

یہ دنیا کا واحد مذہب ہے جو انسان کو طبقات میں تقسیم کرتا ہے اور طبقاتی نظام کی بنیادی ہی ظلم و ناانصافی پر ہوتی ہے۔ طبقات کی موجودگی میں لوگوں کو انصاف ملنا ناممکن ہے۔ اس کے برعکس بدھ مت وہ مذہب ہے جس میں سب انسان برابر ہیں اور طبقات کی کوئی گنجائش نہیں۔ بدھ مت کی بنیاد دو اصولوں پر ہے۔

(1) کسی جاندار کو تکلیف نہ پہنچانا۔

(2) خواہشات کو ختم کرنا۔

تقریباً 534 قبل مسیح میں شمالی ہندوستان میں گوتم نے نروان حاصل کیا اور بدھ بن گیا۔ سدھارتھ گوتم بدھ کے علاوہ بھی بہت سے بدھ گزرے ہیں جنھوں نے گیان دھیان حاصل کیا لیکن سدھارتھ گوتم بدھ کی تعلیمات زیادہ معیاری تھیں اور ان کا باقاعدہ طور پر ایک تحریک کی صورت میں پرچار کیا جاتا تھا۔ گیان حاصل کر لینے کے بعد روحانیت کی اعلیٰ ترین منزل پر پہنچ جانے والے کو بدھ کہا جاتا ہے۔ گوتم بدھ کو مہاتما بدھ بھی کہتے ہیں کیونکہ ان سے پہلے گزرے ہوئے بدھ اتنے مہان نہ تھے۔ اس لیے سب بدھوں میں مہان ہونے کی بنا پر گوتم بدھ کو مہاتما بدھ بھی کہا جاتا ہے اور وہی بدھ مت کے بانی ہیں۔ مہاتما بدھ کی تعلیمات پالی زبان میں تحریر کی گئیں تھیں کیونکہ مہاتما بدھ پالی زبان میں خطاب کرتے تھے۔ جہاں کہیں بدھ نے خطاب کیا ان تحریروں میں جگہ کا نام بھی درج ہے۔ اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ریاست مگدھ میں ہی ان کی زیادہ تبلیغ رہی۔ ایک پروہت نے گوتم سے پوچھا کہ ایک سچے پروہت کی کیا نشانیاں ہیں۔

بدھ نے کہا سچا پروہت وہ ہوتا ہے جو تمام گناہوں سے بچا رہے، وہ عقل مند ہو، عالم فاضل، ہو، اُس نے پاکیزگی میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیا ہو اور اُس سے کسی جاندار کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

مہاتما بدھ کے پروہت بہت سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور اُن کے اندر دنیاوی دولت کی ہوس نہ ہوتی تھی نہ وہ کسی سے ظلم و زیادتی یا لڑائی جھگڑا کرتے تھے وہ مشترکہ طور پر خانقاہوں میں رہتے تھے اور مشترکہ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔

بدھ مت نے ہندو مذہب کے پیدا کردہ طبقات کو ختم کر دیا اور جائیداد یا دولت جمع کرنے کی مخالفت کی۔ ہندو مذہب کے طبقاتی نظام میں پسے ہوئے لوگوں نے تیزی سے اس مذہب کو قبول کرنا شروع کیا تو ہی مذہب تھوڑے ہی عرصے میں برصغیر اور اردگرد کے کافی ممالک میں پھیل گیا۔ اس مذہب کے پیروکار ظلم و جبر دولت کی

لوٹ مار اور مال و زر جمع کرنے کے سخت مخالف تھے۔ ہندو مذہب کے برہمن اور کھشتری طبقے نے جو طبقاتی نظام میں سب سے زیادہ فائدے میں تھے بدھ مت کے خلاف جنگ شروع کر دی اور اس کے ماننے والوں کو بڑی تعداد میں قتل کر دیا گیا۔ اس طرح ہندوستان میں ہندو مذہب دوبارہ طاقتور مذہب بن گیا۔

ہندو مذہب میں طبقات کی پیداوار مذہب سے زیادہ سماج کی پیدا کردہ لگتی ہے۔ جیسے آریاؤں نے برصغیر پر قبضہ کیا تو یہاں کے مقامی باشندوں کو شودر بنا دیا۔

یہودیت اور اشتراکت: بنی اسرائیل کی قبائلی زندگی ویسی ہی تھی جیسی بھیڑ بکریاں پالنے والے چوپانوں کی پرانے زمانے میں ہوتی تھی۔ ہر قبیلہ ایک معاشرتی اور معاشی وحدت ہوتا تھا۔ قبیلے کا سب سے بزرگ کا ہوشیار شخص قبیلے کا سردار ہوتا تھا۔ اُن کے مویشی پورے قبیلے کی مشترکہ ملکیت ہوتے تھے۔ ان پر ہر شخص کا مشترکہ حق ہوتا تھا۔

بنی اسرائیل نے مصر سے فلسطین کی مسافت چالیس برس میں طے کی۔ اس سفر میں انھیں بے آب و گیاہ صحراؤں اور جلتے تپتے ریگستانوں سے گزرنا پڑا، جہاں منزلوں سایہ میسر تھا نہ سبزہ اور پانی۔ آخر کار وہ تنگ آ کر کہنے لگے کہ اس آزادی سے تو فرعون کی غلامی اچھی تھی جس میں ہمیں دو وقت کی روٹی تو مل جاتی تھی۔ اس بیابان میں بھوکے پیاسے مرنے سے تو بہتر تھا کہ مصر ہی میں جوں توں زندگی بسر کرتے، تب خدا نے ان کے لیے من وسلویٰ کی بارش کی اور موسیٰؑ نے اُن سے کہا کہ

یہ وہی روٹی ہے جو خدا نے تم کو کھانے کے لیے دی ہے سو خداوند کا حکم یہ ہے کہ تم اُسے اپنے کھانے کی مقدار کے مطابق یعنی اپنے آدمیوں کے شمار کے مطابق فی کس ایک اومر (ایک خاص پیمانہ) جمع کرنا اور ہر شخص اتنے ہی آدمیوں کے لیے جمع کرے جتنے اُس کے گھر میں ہوں۔ بنی اسرائیل جب تک آباد ملک میں نہ آئے یعنی چالیس برس تک من وسلویٰ کھاتے رہے۔

اس واقعے کا غور طلب پہلو قبائلی مساوات کا وہ اصول ہے، جس کے مطابق موسیٰؑ نے خداوندی نعمت کو تقسیم کیا۔ یہ روٹیاں بنی اسرائیل کی محنت کا پھل نہ تھیں بلکہ اُنھیں مفت ملی تھیں۔ پھر بھی لوگوں کو اس کی اجازت نہیں دی گئی کہ جتنی روٹیاں جی چاہے اُٹھا لے جائیں وہ فقط اپنے گھر والوں کے لیے جمع کر سکتے تھے اور وہ بھی فی کس ایک مقررہ مقدار میں وہ جس نے لالچ میں آ کر اپنی روزمرہ کی ضرورت سے زیادہ روٹیاں اُٹھائیں اُس کے ذخیرہ میں کیڑے پڑ گئے۔

غرضیکہ بنی اسرائیل کا یہ قافلہ من وسلویٰ سے پیٹ بھرتا اور چالیس جگہوں پر ٹھہرتا اور دریائے اُردن کے کنارے پہنچ گیا اور موآب کے میدانوں میں خیمہ زن ہوا کنعان کی سرزمین دریائے اُردن کے اُس پار تھی۔

اور خداوند نے موسیٰؑ سے کہا کہ بنی اسرائیل سے کہہ دے کہ جب تم اُردن کو عبور کر کے ملک کنعان میں داخل ہو تو تم اس ملک پر قبضہ کر کے اس میں بسنا کیونکہ میں نے وہ ملک تم کو دیا ہے کہ تم اُس کے مالک بنو اور قرعہ ڈال کر اس ملک کو اپنے گھرانوں میں میراث کے طور پر بانٹ لینا۔ جس خاندان میں زیادہ آدمی ہوں اُس کو زیادہ اور جس خاندان میں کم آدمی ہوں اس کو تھوڑی میراث دینا اور جس آدمی کا قرعہ جس جگہ کے لیے نکلے وہ اس کو حصے میں ملے۔ تم اپنے آبائی قبائل کے مطابق اپنی میراث لینا۔

اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ بنی اسرائیل اس دور سے گزر چکے تھے جب زمین پورے قبیلے کی مشترکہ ہوتی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان پر شاید یہ دور کبھی آیا ہی نہ ہو کیونکہ ان کا آبائی پیشہ مویشی پالنا تھا نہ کہ کھیتی باڑی کرنا البتہ جب مصر میں انھیں زمین زراعت کے لیے ملی تو اُنھوں نے مصریوں کے قاعدے کے مطابق اس کو خاندان میں تقسیم کیا۔ موسوی شریعت نے اس اصول کو مان لیا لیکن قبائلی عدل ومساوات کا تقاضا یہ تھا کہ جس خاندان میں آدمی زیادہ ہوں اس کو زیادہ اور جس میں آدمی کم ہوں اس کو نسبتاً کم زمین دی جائے۔ نیز زمین کا بٹوارہ قرعہ ڈال کر کیا جائے تاکہ کسی خاندان کو شکایت کا موقع نہ ملے۔

بنی اسرائیل کے سرداروں نے کنعانیوں کے کھیتوں، شہروں، محلوں، صنعت گاہوں اور تجارتی منڈیوں پر قبضہ کر لیا۔ جگہ جگہ اپنی بادشاہتیں قائم کر لیں اور شان وشوکت سے زندگی بسر کرنے لگے، مگر اس مال غنیمت میں عام یہودیوں کی دسترخوان کی بچی کھچی روٹیوں کے سوا کچھ نہ ملا بلکہ اُن کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہو گئی۔ پرانے قبائلی نظام میں اُن کو پورے قبیلے کا تحفظ حاصل تھا اور سب کو روٹی روزگار کی مساوی ضمانت ملتی تھی اب ہر شخص فاقہ کرنے یا نہ کرنے کے لیے آزاد تھا۔

قبائلی نظام میں قانون سب سے یکساں سلوک کرتا تھا اور انصاف کی عدالت سے کوئی فریادی محروم نہیں جاتا تھا۔ نئے نظام میں قانون دولت مندوں کا ساتھ دیتا تھا عدالت کے فیصلے دولت مندوں کے حق میں ہوتے تھے اور سرکاری حکام دولت مندوں کی پشت پناہی کرتے تھے۔

جس طرح ہمارا دولت مند طبقہ مذہبی رسوم پر جی کھول کر خرچ کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے خدا

اس سے خوش ہو جائے گا اسی طرح یہودیوں کا دولت مند طبقہ بھی اسی گھمنڈ میں تھا کہ یہواہ اس کی قربانی سے خوش ہوگا۔

اس معاشی ناہمواری کا ردِعمل ایک اشتراکی فرقے کی شکل میں ظاہر ہوا۔ یونانی، لاطینی اور انگریزی میں اسے ایسین (Essene) کہتے ہیں۔

مشہور مورخ فیلو (20 قبل مسیح تا 50) سکندریہ کا رہنے والا تھا۔ وہ ایک یہودی فلسفی تھا، اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ

فلسطین میں چار ہزار متقی لوگ رہتے ہیں جن کو ایسین کہتے ہیں۔ وہ دیہات میں آباد ہیں اور شہروں میں گریز کرتے ہیں کیونکہ شہروں میں فسق و فجور عام ہے۔ ان میں سے اکثر کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ وہ سونا چاندی جمع نہیں رتے ہیں اور نہ زمینیں اس لیے حاصل کرتے ہیں کہ اپنی آمدنی بڑھائیں بلکہ فقط ضروری معاش کے لیے محنت مشقت کرتے ہیں۔ پس وہی لوگ ہیں جو صاحب املاک نہیں ہیں اس لیے نہیں کہ املاک ان کی قسمت میں نہیں ہے بلکہ اس لیے کہ وہ دولت کی طمع نہیں کرتے لیکن درحقیقت وہی سب سے زیادہ دولت مند ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اصل دولت قناعت اور توکل ہے تجارت، شراب، صنعت اور جہاز رانی ان کے ذہن میں نہیں آتی کیونکہ وہ ان تمام چیزوں سے پرہیز کرتے ہیں جن سے حرص و ہوس پیدا ہو۔ ان میں کوئی غلام بھی نہیں ہوتا سب آزاد ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے کام کرتے ہیں۔ وہ حاکموں اور صوبیداروں سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ ان لوگوں نے مساوات ختم کر دی ہے اور دینِ فطرت کو ترک کر دیا ہے۔ یہ دینِ فطرت ماں کی مانند ہے جو سب کو یکساں پیدا کرتی ہے اور سب کی ضرورت پوری کرتی ہے تا کہ وہ بھائیوں کی طرح پیار اور محبت سے رہیں لیکن یہ رشتہ عیاری اور نفرت کی وجہ سے ٹوٹ جاتا ہے اور اعتماد کی جگہ بداعتمادی اور محبت کی جگہ نفرت پیدا ہوتی ہے۔ ایسیون کو خدا ترسی، راستی اور پاکیزگی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ گھریلو معاملات میں بھی اور قومی امور میں بھی ان کو خیر و شر کا فرق سکھایا جاتا ہے۔ ان کے تین بنیادی اصول یہ ہیں، خدا سے محبت، راستی سے محبت اور بنی نوع انسان سے محبت۔ بنی نوع انسان سے محبت کا اظہار سخاوت، مساوات اور املاک میں اشتراکیت سے ہوتا ہے اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

ان میں سے کسی کے پاس ایسا مکان نہیں ہے جو سب کی ملکیت نہ ہو۔ اس کے علاوہ وہ سماجی طور پر ایک ساتھ رہتے ہیں۔ ہر گھر کا دروازہ ان رفیقوں کے لیے کھلا رہتا ہے جو اور سے آتے ہیں۔ گھر کے اندر کا سب

مال، اسباب کے لیے ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ پوشاک بھی۔

اسی طرح ان لوگوں کے لیے بھی غذا محفوظ رہتی ہے جو مشترکہ کھانے کے اوقات پر نہ پہنچ سکیں ایک ساتھ رہنے اور کھانے کا رواج ان لوگوں سے زیادہ کسی اور قوم میں اتنا عمدہ اور مکمل نہیں ہے۔

بوڑھوں اور بیماروں کی دیکھ بھال بڑی شفقت سے کی جاتی تھی۔ ان کے لنگر خانوں میں ایک وقت فقط ایک ہی چیز پکتی تھی۔ اس قلندرانہ زندگی کے باوجود ان کی رہبانیت سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا بلکہ وہ عام لوگوں کے غموں اور خوشیوں میں برابر شریک ہوتے تھے اور ان کے مسائل سے پوری دلچسپی رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ ملک کی سیاسی جدوجہد میں بھی حصہ لیتے تھے۔

ان واقعات سے ہمیں یہودیت میں اشتراکیت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

آیئے اب ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ عیسائیت میں اشتراکت کی کس قدر اہمیت ہے۔

عیسائیت اور اشتراکیت: حضرت عیسیٰ اب سے تقریباً 2012 برس پہلے فلسطین کے شہر بیت اللحم میں پیدا ہوئے۔ اُن کی والدہ حضرت مریمؑ صوبہ گلیل کے شہر ناصرہ کی رہنے والی تھیں۔ اُن کی منگنی یوسف نامی ایک بڑھئی سے ہوئی تھی جو صوبہ یہودیہ کے شہر بیت اللحم سے آ کر ناصرہ میں بس گیا تھا فلسطین پر ان دنوں سلطنت روم کے شہنشاہ قیصر آگسٹس (63 قبل مسیح تا 14 عیسوی) کا قبضہ تھا۔ اُس نے فلسطین کو تین صوبوں گلیل، یہودیہ اور اَتوریہ میں بانٹ رکھا تھا اُن دنوں ایسا ہوا کہ قیصر آگسٹس کی طرف سے یہودیوں کی مردم شماری کا حکم جاری ہوا اور اعلان کیا گیا کہ لوگ اپنے اپنے آبائی شہروں میں جائیں اور نام لکھوائیں۔ بس یوسف بھی حضرت مریمؑ کو (جو حاملہ تھیں) لے کر اپنے شہر بیت اللحم کو روانہ ہوا۔ جب وہ شہر میں پہنچا تو رات ہو چکی تھی اور اُس کو رات بسر کرنے کے لیے کہیں جگہ نہ ملی۔ لہٰذا اُس نے ایک سرائے کے باہر ڈیرہ لگایا۔ حضرت عیسیٰؑ وہیں پیدا ہوئے۔

آٹھ دن کے بعد حضرت عیسیٰؑ کے والدین نومولود کو لے کر یروشلم چلے گئے اور شریعت موسوی کے مطابق ولادت کی رسمیں ادا کیں اور تب ناصرہ واپس آئے اور وہ لڑکا بڑھتا اور قوت پاتا گیا اور حکمت سے معمور ہوتا گیا۔

مسیحؑ نے تیس برس کی عمر میں اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کی۔ وہ گاؤں گاؤں پھرتے اور عام لوگوں کو راہ راست کی تلقین کرتے اور بیماروں کا علاج کرتے اور دُکھیاروں کو تسلی دیتے اور مظلوموں کو خدا کی بادشاہت کی خوشخبری سناتے تھے۔

''مبارک ہو تم جو غریب ہو کیونکہ خدا کی

بادشاہت تمھاری ہے۔ مبارک ہو تم جو بھوکے ہو کیونکہ تم آسودہ ہو۔"

یہ نیا مذہب صریحاً دولت مندوں کے خلاف تھا۔ چنانچہ حضرت مسیحؑ صاف صاف لفظوں میں ان کی مذمت کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے اور اُن کا فیصلہ تھا کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتے۔

یسوعؑ نے ایک دولت مند کو دیکھ کر کہا کہ دولت مندوں کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا کیسا مشکل ہے کیونکہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزرنا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔

حضرت مسیحؑ کو اپنے خیالات کی تبلیغ کے لیے فقط تین سال کی مہلت ملی۔ مگر اس مختصر سی مدت میں بھی فلسطین کے ہزاروں باشندے اُن کے پیروکار ہو گئے اور یہودیوں کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ اگر اس نئے فتنے کو نہ روکا گیا تو فلسطین کے امرا اور دولت مندوں کے طبقاتی مفاد کو سخت نقصان پہنچے گا۔ لہٰذا حضرت عیسیٰؑ پر مذہب اور رومی سلطنت سے بغاوت کا الزام لگایا گیا اور نہ صلیب پر چڑھا دیا گیا۔

حضرت مسیحؑ کی تعلیمات کو ان کے چار شاگردوں متی، مرقس، لوقا، اور یوحنا نے مرتب کیا ہے۔ یہ تصانیف انجیل کے نئے عہد نامے کے نام سے مشہور ہیں۔ حضرت مسیحؑ کی ہمدردیاں، محتاجوں، مفلسوں اور مظلوموں کے ساتھ تھیں اور دولت مندوں، سرداروں اور کاہنوں کے طبقے کے سخت خلاف تھے۔

اُن کی روزانہ کی زندگی بھی اُن کے طرزِ فکر کی شہادت دیتی ہے۔ چنانچہ اُن کے شب و روز غریبوں میں گزرتے تھے وہ اُن کے شاگرد غریبوں کے سے موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے، غریبوں کے جھونپڑوں میں رہتے اور اُن ہی کی طرح کی خوراک کھاتے، دولت کی طمع ان کے قریب نہ آتی تھی اور شان و شوکت اور جاہ و مرتبے کی خواہش اُن کو کبھی نہ ستاتی تھی۔ وہ صحیح معنوں میں انسان دوست تھے اور انسانوں کی خدمت کرنا اُن کا مسلکِ حیات تھا۔

چنانچہ یعقوب جو حضرت مسیحؑ کے بارہ شاگردوں میں تھا اس پر خفا تھے کہ دولت مند طبقہ محنت کشوں کا استحصال کرتا ہے اور اُن کو اُن کے حق سے محروم کرتا ہے وہ لکھتا ہے۔

حضرت مسیحؑ کی وفات کے بعد اُن کے شاگردوں کی زندگی اسی ڈگر پر چلتی رہی۔ بلکہ اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے لیے اُنھوں نے اپنی طرزِ معاشرت کو اشتراکی انداز میں ڈھال لیا وہ ایک ساتھ رہتے ایک ساتھ کھاتے تھے اور اپنی ساری پونجی اُنھوں نے یکجا کر لی تھی۔ یعقوب اپنی

کتاب میں لکھتا ہے کہ
اور جو ایمان لائے تھے وہ سب ایک جگہ رہتے تھے اور سب چیزوں میں شریک تھے اور اپنی جائیداد اور اسباب بیچ بیچ کر ہر ایک کو ضرورت کے موافق بانٹ دیا کرتے تھے۔
آگے چل کر وہ اس گروہ کے بارے میں لکھتا ہے کہ
اور ایمان داروں کی جماعت ایک دل اور ایک جان تھی اور کسی نے بھی اپنے مال کو اپنا نہ کہا بلکہ ان کی سب چیزیں مشترک تھیں۔ ان میں کوئی بھی محتاج نہ تھا اس لیے کہ جو لوگ زمینوں یا گھروں کے مالک تھے۔ ان کو بیچ بیچ کر بکی ہوئی چیزوں کی قیمت لاتے اور پیشواؤں کے پاؤں میں رکھ دیتے تھے۔ پھر ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق بانٹ دیا جاتا تھا۔
بہرحال مسیح کے شاگردوں نے اپنے اور اپنے مختصر عقیدت مندوں کے لیے اشتراکی زندگی کی جو روایت قائم کی تھی وہ کم از کم مذہبی پیشواؤں میں تین چار سو سال تک جاری رہی۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ جب عیسائی مذہب یونانی اور لاطینی علاقوں میں پھیلا تو ابتدا میں وہ ان علاقوں میں بھی مظلوموں اور غریبوں کا ہی مذہب تھا یہ لوگ قدرتی طور پر دولت مندوں سے نفرت کرتے تھے۔ لہٰذا ان کے پیشواؤں کو بھی ان کی ہمنوائی میں ایسا طریقہ زندگی اختیار کرنا پڑتا تھا جو دولت مندوں سے مختلف ہو اسی طرح سنت بازیل اعظم (330 تا 379ء) یونانی تھا اور قیصریہ میں پادری کے فرائض انجام دیتا تھا وہ بھی دولت مندوں کو حقارت سے دیکھتا تھا اور کہتا تھا۔
دولت کی قوت کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اس کے استبداد کے آگے ہر شے جھک جاتی ہے۔ کیا تم (دولت مند) چور اور ڈاکو نہیں ہو۔ تمھارے پاس جو روٹی ہے وہ بھوکوں کی ملکیت ہے جو، جو تا تم نے پہن رکھا ہے وہ ننگے پیروں کی ملکیت ہے اور جو چاول کا ذخیرہ تم نے جمع کیا ہے وہ حاجت مندوں کی ملکیت ہے۔
سنت بازیل اعظم دولت اور دولت مندوں کی مذمت پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ مشترکہ ملکیت کی تلقین کرتا وہ کہتا ہے کہ
ہم لوگ جن کو عقل عطا ہوئی ہے ان جانوروں سے بھی زیادہ ظالم ہیں جو بے عقل ہیں۔ جانور تو زمین کی پیداوار کو مشترکہ اشیاء کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ بھیڑوں کے گلے ایک ہی مشترکہ چراگاہ میں چرتے ہیں۔ گھوڑے ایک ساتھ مل کر ایک ہی جنگل میں چرتے ہیں۔ لیکن ہم ان چیزوں کو اپنی ذاتی ملکیت بنا لیتے ہیں جو سب کے لیے مشترک ہوتی ہیں۔ آؤ ہم یونانیوں اور اُن کے طرز زندگی کی تقلید کریں جو انسان دوستی پر مبنی تھی یہ لوگ ایک ہی دسترخوان پر

ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے (اسپارٹا کا معاشرہ مراد ہے)۔

عیسائیت کا مشہور پادری سنت آگستین (354 تا 430ء) جو سنت امبروز کا شاگرد تھا۔ وہ ابتدا میں مانی کا معتقد تھا لیکن سنت امبروز کی تعلیمات سے متاثر ہو کر عیسائی ہو گیا تھا وہ توریت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

میرے پیارے بھائیو! ذاتی املاک کے باعث مقدمے بازیاں ہوتی ہیں۔ لوگوں کے درمیان لڑائیاں ہوتی ہیں۔ بلوے ہوتے ہیں۔ بغض اور عناد پھیلتا ہے۔ قتل اور دوسرے گناہ ہوتے ہیں اور یہ سب کس لیے؟ اس لیے کہ ہماری الگ الگ جائیدادیں ہوتی ہیں۔

لہٰذا میرے بھائیو ہمیں ذاتی ملکیت سے بچنا چاہیے اور اگر اس سے بچ نہ سکیں تو کم از کم اس سے محبت تو نہ کریں۔

غرضیکہ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت مسیحؑ کے عہد سے تقریباً چار سو سال تک ایسے بے شمار مسیحی پیشوا گزرے ہیں جو دولت اور دولت مندوں سے نفرت کرتے تھے۔ وہ درویشوں جیسی سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور انھوں نے اپنے اور اپنے مریدوں کے لیے اشتراکی زندگی کو چن لیا تھا۔ وہ ذاتی ملکیت کو تمام خامیوں کی جڑ سمجھتے تھے اور عیسوائیوں کو ذاتی ملکیت سے دور رہنے کی تلقین کرتے تھے۔

البتہ جب رفتہ رفتہ دولت مندوں نے خود سلطنتِ روم کے فرمانوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تو مسیحی کلیسا کا کردار بدل گیا۔ اب تک عیسائی پادری سرکاری دربار سے دور اپنی خانقاہوں میں رہتے تھے اور مظلوموں اور محتاجوں کی دل جوئی کرتے تھے۔ وہ دولت کو گناہ اور دولت مندوں کو خدا کی بادشاہت سے محروم خیال کرتے تھے۔ مگر اب وہ خود صاحب دولت ہو گئے تھے۔ وہ عالیشان مکانوں میں رہتے اور کلیسا کی لاکھوں کی جائیداد کو اپنے تصرف میں لاتے تھے۔ پہلے وہ اپنے وعظوں میں ذاتی ملکیت کی مذمت کرتے تھے۔ اب وہ ذاتی ملکیت کو عطیہ خداوندی کہتے اور عوام کو اطاعت و قناعت کا سبق دیتے تھے غرضیکہ مسیحی کلیسا سلطنت کا اہم ستون بن گیا اور اس کا مفاد ریاست سے وابستہ ہو گیا اور وہ ریاست کے ظلم و استبداد اور لوٹ کھسوٹ کے لیے مذہبی جواز فراہم کرنے لگا۔

وہ اشتراکی زندگی جس پر حضرت عیسیٰؑ کے شاگرد اور دوسرے عیسائی پیشوا ناز کرتے تھے اب خواب و خیال ہو گئی۔ اس کے برعکس کلیسا نے عوام کی تحریک کے مخالفت ہی کو اپنا شعار بنا لیا۔

[جاری ہے۔]

غافر شہزاد کی ناول نگاری کا فن

غافر شہزاد نے فکشن نگاری کا آغاز 1980 کی دہائی کے وسط میں کیا تھا، تب وہ افسانے لکھتا تھا۔ پہلا افسانہ ''ادھورا آدمی'' نوائے وقت راولپنڈی کے ادبی صفحہ پر شائع ہوا جب ادب کے لیے اخبار کے دو صفحات مختص ہوتے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کشور ناہید 'ماہ نو' کی مدیر مقرر ہوئیں۔ غافر شہزاد نے اپنا ایک افسانہ کشور ناہید کو بھیجا۔ ان دنوں کشور ناہید نے بہت سے سینئر افسانہ نگاروں کو ان کے غیر معیاری افسانے واپس بھیج کر ناراض کر دیا تھا۔ غافر شہزاد کا افسانہ 'ماہ نو' میں شائع ہوا تو وہ سنجیدگی سے فکشن نگاری کی جانب متوجہ ہوا۔ اس کے بعد اس کے افسانے احمد ندیم قاسمی کے ادبی مجلہ ''فنون''، عطاالحق قاسمی کے ''معاصر'' اور صدیقہ بیگم کے رسالہ ''ادب لطیف'' میں شائع ہوتے رہے۔ 1990 میں غافر شہزاد کا اوّلین افسانوی مجموعہ ''تصویریں سانس لیتی ہیں'' شائع ہوا جس کے بیک فلیپ پر احمد ندیم قاسمی صاحب نے لکھا تھا کہ غافر شہزاد ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر لکھنے والا افسانہ نگار نہیں ہے بلکہ جنگاہ حیات میں عملی طور پر شامل ہے، وہ روایت اور جدت کے اتصال پر کھڑا ہے۔

غافر شہزاد کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''خوابوں کی گرہ میں پڑی لڑکی'' 1995 میں اشاعت پذیر ہوا۔ دونوں افسانوی مجموعے طاہر اسلم گورا نے اپنے اشاعتی ادارے سے شائع کیے اور ان دو کتابوں کے درمیان میں غافر شہزاد کا شعری مجموعہ ''چراغ آنکھوں میں'' 1991 میں ادب کے قاری تک پہنچا جس کا دیباچہ امجد اسلام امجد جب کہ فلیپ احمد ندیم قاسمی اور عطاالحق قاسمی نے لکھے تھے۔

فکشن نگاری کو آگے بڑھاتے ہوئے غافر شہزاد نے اپنا اوّلین ناولٹ ''لوک شاہی'' 1998 میں شائع کیا۔ یہ ایک ناول کا اوّلین

شاہدہ دلاور شاہ

حصہ تھا دو حصے ''افسر شاہی'' اور ''نوکر شاہی'' کے عنوان سے لکھے جانے تھے مگر مکمل نہ ہو سکے۔ ان تین حصوں نے اکٹھے ایک ناول کی صورت میں شائع ہونا تھا۔ پھر ایک طویل وقفہ آ گیا۔ 2012 اور 2013 کے دورانیے میں غافر شہزاد نے دو ناول لکھے مگر شایع نہ ہو سکے۔ پھر چند برس اور گزر گئے۔ غافر شہزاد کا خیال تھا کہ ''پالنہار'' کو شائع کیا جائے مگر جب اس کی تدوین شروع کی تو ''مسکلی میں مرگ'' کا پلاٹ ذہن میں آ گیا۔ یوں 2020 میں غافر شہزاد کا اوّلین ناول ''مسکلی میں مرگ'' شائع ہوا جسے اُس برس 10 ویں یو بی ایل ادبی ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا۔ بعد ازاں غافر شہزاد نے لاہور رنگ روڈ پر ہونے والے ایک واقعہ کو بنیاد بنا کر ''کرول گھاٹی'' لکھا 2022 - میں شایع ہونے والے تیسرے ناول ''استغاثہ'' کو بھی 11 ویں یو بی ایل ادبی ایوارڈ کے لیے شارٹ لسٹ کیا گیا۔ 2023 میں ''موکش'' اور حال ہی میں ''اگر تلا'' کی اشاعت ہوئی ہے۔

غافر شہزاد کی ناول نگاری کا اگر اجمالی جائزہ لیا جائے تو واضح احساس ہوتا ہے کہ اس کا فکشن کا اسلوب اور ناولوں کے پلاٹ روایتی نہیں ہیں۔ وہ اپنے ناول میں کسی ہیرو یا ہیروئن کے کردار کے گرد کہانی کا تانا بانا نہیں بنتا۔ اس کی کہانی میں ''وقت'' افقی یا عمودی سمت میں آگے نہیں بڑھتا اور نہ ہی وہ معاشرے کی یک سطحی صورت حال کو بیان کرتا ہے۔ ایک بڑے کینوس پر اس کا قلم ایک ہی وقت میں کئی جہات کے منظر نامہ کو اپنی فکشن کی بنیاد بناتا ہے۔ اس نے حقیقی زندگی میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات میں فکشن کا رنگ بھر کے ناولوں کے پیکر تراشے ہیں۔ وقت، کردار اور کہانی ایک ہی وقت میں کثیر جہتی منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ طلسماتی حقیقت نگاری کی تکنیک کو بھی ناولوں میں بروئے کار لاتا ہے، کہیں حقیقت فکشن میں ڈھل جاتی ہے؛ کہیں فکشن حقیقت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ غافر شہزاد کے ہر ناول میں زندگی یا فلسفے کا کوئی ضابطہ کرداروں کی پیش کش میں بنیادیں فراہم کرتا ہے۔

''مسکلی میں مرگ'' کا بنیادی موضوع ایک ایسی زندگی ہے جو مرنے کے بعد لوگوں کے ذہنوں میں ہمیشہ کے لیے موجود رہ جاتی ہے۔ اس ناول میں صوفیا کے حوالے پیش کیے گئے ہیں، جن کے انتقال کے بعد مریدین اُن کے مزاروں پر حاضری دیتے ہیں۔ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد جسم تو ختم ہو جاتا ہے مگر شخصیت لوگوں کے ذہنوں میں نسل در نسل زندہ رہتی ہے، یہ زندگی کی کون سی شکل ہے؟ ناول میں ایک مزار کی شناخت کی تبدیلی ہے۔ اس کے علاوہ روایتی اور جدید فن تعمیر کے حوالے سے مزارات کی تعمیرات تاریخ کے تناظر میں ناول کی کہانی کو آگے بڑھاتی ہے۔ بانسوں کی مدد سے ایسی تعمیرات کی جاتی ہیں جن سے توانائی اور کاربن کا اخراج صفر ہے مگر

این جی اوز خوب پیسے بنا رہی ہیں۔ اس ناول میں فن تعمیر کے حوالے سے روایتی اور جدید فن تعمیر کی حامل عمارتوں پر بھی بحث کی گئی ہے کہ کیسے روایت جدیدیت میں ڈھل جاتی ہے۔

دوسرا ناول ''کرول گھاٹی'' رنگ روڈ کے کنارے بچوں کے سامنے ایک ماں کی آبرو ریزی کے واقعے پر بنیاد رکھتا ہوا، مختلف سرکاری اداروں اور میڈیا کے سچ اور جھوٹ کے حوالے سے ایک ان کہی کہانی کو پیش کرتا ہے جس میں ''واقعہ ساز'' اور ''کیمرا کباڑ'' جیسے کردار تراشے گئے ہیں۔ اکیسویں صدی میں میڈیا جس طرح سچ کی ساخت کر کے ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہے، اس کی حقیقی تفصیلات ملتی ہیں۔ ناول کی ایک اور خاص بات سعادت حسن منٹو کا کردار ہے جو ایک مبصر کے طور پر اس واقعہ کی پیش رفت پر پروگرام ''منٹو کے مطابق'' میں اپنے افسانوں کے حوالے دے کر تبصرے کرتا ہے۔ یہ تبصرے اور حوالے ایسے بروقت اور واقعہ کی تفتیش کے ساتھ ایسے جڑے ہوئے ہیں کہ سنجیدہ قاری داد دیے بغیر نہیں رہتا۔

ناول ''استغاثہ'' میں ایک سرکاری ملازم (آرکی ٹیکٹ) کی درخواست عدالتِ عالیہ میں پیش کی گئی ہے جو اپنے سامنے بیوروکریٹس اور ٹیکنوکریٹس کے کردار اور پیشہ ورانہ کرپشن کے تذکرے پر مبنی ہے۔ انصاف کا طالب یہ کردار عدالتی نظام، پولیس، سیف سٹی پراجیکٹ، سوشل و الیکٹرونک میڈیا اور پراجیکٹس میں ہونے والی کرپشن کے ایسے پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے کہ جو حقیقت لگنے لگتے ہیں۔ ایسے اداروں میں جہاں کرپشن ہوتی ہے، صحافیوں نے بھی استحصال کے اپنے موثر کردار وضع کر لیے ہیں۔ سرکاری اداروں میں مشہور فلاسفر نیٹشے کی پیش کردہ غلامی کی خصوصیات (تذلیل، برداشت و صبر اور تابع فرمانی) کے تناظر میں سرکاری ملازم کے کردار کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

ناول ''موکش'' میں موت اور زندگی کے حوالے سے پلاٹ بنا گیا ہے جس میں موت ایک کردار کے طور پر اپنی بپتا گی بیان کرتی ہے جب کہ صدیوں سے چلا آنے والا بیانیہ منہدم ہوتا دکھائی دیتا ہے کہ جس کے مطابق: موت کے لیے وقت اور جگہ کا تعین پہلے سے کر دیا گیا ہے۔ ناول میں حقیقی طور پر ہونے والی تین اموات ہوئی ہیں جو ناول نگار کے بیانیے کو تقویت دیتی ہیں۔ ناول کا آغاز ایک تعزیتی ریفرنس سے ہوتا ہے۔ یہ اموات چوں کہ ادیبوں شاعروں کی ہیں، اس لیے ناول نگار نے اس میں لاہور کے ادبی منظر نامہ اور پاک ٹی ہاؤس کی سرگرمیوں کا تذکرہ ناول میں کیا ہے۔ موت اور زندگی کے درمیان برابر سطح کا مکالمہ اور مقابلہ ناول میں ملتا ہے۔

ناول ''اگر تلا'' مغربی پاکستان کے ایک خاندان کی تین نسلوں کی کہانی ہے جن کا کہنا ہے کہ ہجرت نہ کر کے انھوں نے کوئی قربانی وطن کے لیے نہیں دی۔ اس لیے لازم ہے کہ وہ

اب ملک کی خدمت کریں۔ ناول کا آغاز ایک پریس کانفرنس سے ہوتا ہے جہاں ایک بیوروکریٹ کچھ اعتراف کرتا دکھائی دیتا ہے۔ خاندان کی پہلی نسل تحریک پاکستان سے وابستہ ہے، دوسری نسل میں پاک آرمی میں شمولیت کر کے سرحدوں کی حفاظت کی جاتی ہے جب کہ تیسری نسل میں بیوروکریٹ بن کر ملک کے انتظامی معاملات کو دیکھا جاتا ہے۔ یہ ناول پاکستان کی 75 سالہ سیاسی سماجی، تاریخی، معاشی صورتحال اور اقتدار کی کشمکش کو موضوع بناتا ہے اس میں پاکستان ایک کردار کے طور پر اپنی کہانی بھی بیان کرتا ہے اور جغرافیائی اعتبار سے پاکستان کے اوکیل کے ساتھ عالمی قوتوں کی دلچسپی کو فوکس کرتے ہوئے کیپیٹل ازم اور سوشل ازم کی آپسی لڑائی کا تذکرہ بھی ناول میں ملتا ہے۔ پاکستان کے تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا یہ ناول کچھ حقائق اور کچھ فکشن پر مبنی ہے۔

غافر شہزاد کے پانچ ناول اور ایک ناولٹ پڑھنے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ محض کرداروں کو جوڑ کر کہانی آگے نہیں بڑھاتا بل کہ اس کے ہر ناول کی نظریاتی اور علمی بنیادیں ہیں جہاں وہ اپنی سوچ اور تخئیل کے مطابق کوئی بیانیہ ترتیب دیتا ہے۔ اس کے موضوعات اور کرداروں میں اتنا زیادہ تنوع ہے کہ یہ اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ دو ناول کسی ایک ناول نگار نے لکھے ہوئے ہیں۔ وہ زبان کا استعمال نہایت مہارت اور سادگی سے کرتا ہے۔ اسے کسی قسم کی بھاری بھرکم اصطلاحات یا مشکل زبان کا سہارا نہیں چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ناولوں میں خواندگی کی اہلیت بہت زیادہ ہے۔ اس کا ناول شروع کر لیں تو اسے مکمل پڑھے بغیر چھوڑا نہیں جا سکتا۔ وہ اپنے ہر موضوع کے بارے میں تحقیق کرتا ہے اور پھر اس تحقیق کو تخلیق لبادے میں ڈھال کر اپنے فکشن میں پیش کرتا ہے۔ اس نے حالیہ وقوع پذیر ہونے والے واقعات و سانحات پر بھی لکھا ہے وہ اس بات کو نہیں مانتا کہ تجربہ کو پکنے میں ایک وقت درکار ہوتا ہے۔ اس کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر ناول نگار کی سمجھ بوجھ پختہ ہے، زندگی کے بارے میں اس کے نظریات واضح ہیں، اسے کسی سانحے کو سمجھنے اور تخلیقی رنگ میں ڈھالنے کے لیے کوئی وقت درکار نہیں ہے۔ اس کے افسانوں میں حقیقت پسندی اور حقائق یوں پیش کیے جاتے ہیں کہ حقیقت اور فکشن مل کر ''فیکشن'' بن جاتے ہیں۔ غافر شہزاد کے فکشن میں غیر ضروری تفصیلات نہیں ملتی۔ کردار اور منظر نامہ کو بیان کر کے وہ اپنا اور اپنے قاری کا وقت ضایع نہیں کرتا۔ وہ روایتی فکشن کی طرح کرداروں کی زبانی ایسی تفصیلات بیان نہیں کرتا کہ جس سے ناول طوالت کا شکار ہو جائے یا بوریت کی نذر ہو جائے۔ کسی کردار کا امیج قاری کے ذہن میں بٹھانے کے لیے دو چار جملے ہی کافی ہوتے ہیں، اس کے آبا اجداد کے شجرے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

☆☆☆☆☆

شہر کا شہر ہوا اپنا

آج کوؤں کی چہچہاہٹ سے بیدار ہوا تو ابھی اندھیرا تھا، ایسا نہیں کہ پرندے اندھیرے میں بیدار نہیں ہوتے اصل میں پرندے رہے نہیں کوے بچ گئے ہیں سو مجبوراً کائیں کائیں کو چہچہاہٹ کہنا پڑتا ہے۔

لوگ اسے تبدیلی کہتے ہیں میں اسے نہیں مانتا تھا پر سوشل میڈیا منوا کے رہا۔ بچپن سے اب تک کسی نے گالی نہیں دی، آخری عمر میں ڈر لگتا ہے سو ماننے میں عافیت ہے۔ ہم عافیت ڈھونڈنے نکلے تھے ڈھیروں غیر عافیتیں نظر پڑیں سوچا پنڈ بھاگ چلیں پر نوکری مل گئی سرکاری بھی گھریلو بھی اور ہم نے گھریلو کو بھی سرکاری کی طرح نبھایا۔

شہر کے ہو رہے مگر سالوں گزارنے کے بعد سمجھ آئی "شہر دا شہر پرایا سی"

سمجھ اب بھی نہ آتی اگر برادرم صفدر واثق نہ سمجھاتے۔ سمجھانے والوں کی قلیل تعداد میں جناب صفدر واثق سرِفہرست ہیں، شعر ہی شعر میں کیا کیا معاملہ سلجھا دیتے ہیں ایک زمانے میں تو انھیں ایک عفیفہ تک نے بہت پکارا "لٹ الجھی سلجھا جا رے بالم" معلوم نہیں اُدھر گئے یا نہیں مگر یہ جانتے ہیں کہ یہ ادھر پوری دل جمعی سے رہے۔ جی ہاں شاعری کی طرف اور شاعری بھی ایسی جس میں عہد ہے، عصر ہے، مقامیت ہے، آفاقیت ہے۔

عہد کی تاریخ ہے، عصر کا المیہ ہے، مقامیت کی ثقافت ہے آفاقیت کا کرب ہے۔

صفدر واثق تو شاید عذرا کی تلاش میں نکلا تھا اسے یہ سب کچھ مل گیا۔ صحرائیت سے گزر آیا تو شہر نوردی نے بھی آخر اسی نتیجے پر پہنچایا کہ "شہر دا شہر پرایا سی"

صفدر واثق کو گلا اجنبیت سے ہے۔ بے قرار، مضطرب اور اضطرار زدہ بدلتی تہذیب، مفرور اقدار، طوفان آشنا ثقافت اور ہجرت آمادہ زبان سب اجنبیت کی جنگ کا ایندھن ہے کہرام ہے چیخ و پکار ہے، شور شرابا ہے اور مابین کھڑا ہکا بکا صفدر موافق۔

صفدر موافق اور میرا نسیت کا اشتراک یہی ہے۔

عرفان جمیل

ایک بینڈ کے ریڈیو سیٹ پر میرے پند کے بابے رحمتے نے کہا تھا "قیامت دیاں نشانیاں نیں" بابا تو جلدی جان چھڑا گیا، میں اور صفدر وامق روز قیامت کی نئی نشانیاں دیکھتے موجودہ عمر کو پہنچے۔ واٹس ایپ کی ویڈیو کال کو البتہ میں جنت کو نشانیوں میں شمار کرتا ہوں اگر دوسری طرف غزل ہو۔ ہم شاعر لوگ ہیں۔ غزالوں اور غزلوں سے محبت کرنے والے ۔ صفدر وامق البتہ عذرا وغیرہ کے عشق میں نظمیں بھی کہتے ہیں، غزلیں بھی، پہلا مجموعہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ غزلیں بھی تغزل مآب۔ تغزل بھی دھلی نکھری، خالص، سچی زبان میں۔ لہجہ معیاری، انداز منفرد، تخیل جدید، برت ماہرانہ اور مضامین عاشقانہ۔ اس عشق میں وہ بھی شامل کرلیں جو آتش میں کود پڑا تھا وہ بھی جو رومی، شمس تبریز، سعدی اور شیرازی کے ہاں ملتا ہے۔ وہ بھی جو میر، غالب اور فیض کے پاس موجود ہے پر صفدر وامق بابا فرید گنج شکر، دمودر، گرونانک، شاہ حسین، سلطان باہو، بلھے شاہ، وارث شاہ، میاں محمد بخش، شاہ ہاشم، استاد دامن، فقیر محمد فقیر اور حیدر ملتانی کے عشق کا نظارا کرتے بھی نظر آتے ہیں:

قلم ایجی سکھی اوہدے جو بن توں
نقطہ نقطہ شکل بنانی اکھراں دی

معنے ، مطلب آپے نتر آون دے
اکھراں دے وچ مار مدھانی اکھراں دی

.....

صفدر وامق ورودِ شعر پر قناعت نہیں کرتے وہ مدھانی، ریاضت اور مشق کو اظہار ماضی الضمیر کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔ وامق پر دو طرح سے حکم ہیں۔ دانش، دانائی والے بھی، پڑی دوائی والے بھی۔ گشتے کا فن جانتے ہیں۔ گھرل کے رموز سے واقف ہیں۔ شعر کے بطن سے جب تک شعریت نمودار نہ ہو وقناعت کا نسخہ نہیں آزماتے۔ اسی لیے پختہ کاری ان کی شاعری کا نمایاں ترین وصف دکھائی دیتا ہے:

لیکھن نری تریہہ وے لوکا ، بھلیا لوکا
ٹیاں لاواں ، پانا بوکا ، بھلیا بوکا

.....

اکھ اُگھڑی تے شہر دا شہر پرایا سی
جتھے اسیں خواباں دے محل سجاندے رہے

.....

اسیں تے اپنا ننگ لکاندے پردے ساں
لوکاں ساڈے ون سوتے ناں رکھ لیے

.....

رَبا سجدے کرنے نیں
کنیاں ہور خداواں نوں

.....

دُھوڑ ولھیڑیاں راہواں وامق دسیا اے
جدھر توں پیا جانایں سارے نیں جاندے

.....

رُس جاندی اے راتیں نیندر
جس دن اکھیاں بھر کے ویکھاں

.....

صفدر وامق صاحب! پرائے شہر کی حکمرانی اور کتاب _ خوب صورت کتاب کی اشاعت اور پزیرائی مبارک ہو۔

☆☆☆☆☆

بات کہہ جاتا ہوں میں سادہ بیانی میں ندیم

ریاض ندیم نیازی سبی کے سنگ لاخ پہاڑوں اور دہکتی فضاؤں سے اُبھرتی ہوئی ایک ٹھنڈی میٹھی آواز ہے۔ وہ قدیم اور جدید کے سنگم پر ایستادہ اپنے عہد کا عکاس اور خوش آہنگ سخن ور ہے جو اپنے زخموں کی کستوری میں درد و غم سمو کر غزل کی رسیلی بانہیں پھیلائے چلا جا رہا ہے۔ اس کے گلشنِ سخن میں جذبوں کی خود کار چمن آرائی ہے اور اُس کے دامن میں خلوص اور محبت کی خوش بو دار کلیاں ہیں۔ وہ احساس اور تخیّل کے باہمی عمل سے سخن کی مہک پھیلاتا ہے اور--- بہ قول انور سدید ''پتھروں سے پھول اُگاتا ہے''

غزل کاری کا رس کشید کرتے ہوئے ریاض ندیم نیازی پہیلیاں نہیں بجھواتا سیدھے سبھاؤ انداز میں ہم تک اپنے احساسات پہنچاتا ہے۔ مختصر بحر میں اُس کی ایک غزل کے اشعار دیکھیے:

روٹھنا تو ہم کو تھا
وہ مگر خفا نکلے
میرے گھر کے رستے میں
اُس کے نقشِ پا نکلے
ہم نے مُنہ نہیں کھولا
جانے منہ سے کیا نکلے

ریاض ندیم نیازی کی سادگی میں پُرکاری ہے اور سادہ بیانی کی روانی ہے۔

کیا ہے ہم نے تجھے منتخب زمانے میں
اب اِس کے بعد ترا انتخاب دیکھتے ہیں

.....

جسے دیکھو وہ گھبرایا ہوا ہے
یہاں ہونا ہے یا کچھ ہو گیا ہے
ہمیں کچھ بھی نہیں معلوم لیکن
جسے دیکھو ہمی سے پوچھتا ہے!

.....

بات کہہ جاتا ہوں میں سادہ بیانی میں ندیم
ہے یہ اک رمز کہ مشکل مرے اشعار میں ہے

.....

ریاض ندیم بلوچستان کا باسی ہے سو خون گرم مگر لہجہ حد درجہ نرم رکھتا ہے۔ بات بھلمنساہٹ سے کرتا ہے اور اپنے اندر کے جوار بھاٹے کو کسی آتش فشاں لاوے کی طرح اُبل کر باہر آنے سے گریزاں رہتا ہے۔ کلام کرتا ہے تو دُلار سے، وضع داری کے ساتھ۔ تہذیبی رچاؤ میں گھول کر، شعر کہتا ہے تو سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ اپنا دل بھی اپنے اشعار میں پرو کر رکھ دیتا ہے اور لفظ لفظ روئی کے گالوں پر رکھ کر پیش کرتا ہے۔ کرب کے عالم میں بھی سکون اور قرینے کا سرچشمہ ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتا:

شجاعت علی راہی

اُس کو اپنی ہر غزل میں بُن رہا ہوں لفظ لفظ
اور ہر انداز سے پھر چُن رہا ہوں لفظ لفظ

.....

سیاسی شعور ریاض ندیم نیازی کے اندر کچھ ایسا رچا بسا ہُوا ہے کہ اُس کے پرانے اشعار بھی نئی بجھتی ہوئی بساط سیاست پر محیط ہیں۔ وہ طبقاتی سماج کے چھل کپٹ سے شناسا ہے اور جانتا ہے کہ وہ منافقوں کی بستی میں بس رہا ہے لیکن بات قرینے سے کرتا ہے:
دلوں کے احوال سے سب آگاہ ہو چکے ہیں
کہ صرف لفظوں کی مہربانی نہیں چلے گی

.....

پھر سوچیے بنے گا کہاں اور کس طرح
گھر کا حضور پہلے تو نقشہ بنائیے

.....

کچھ اقربا ہیں میرے ذخیروں کے پاسباں
بھوکے ہیں کتنے لوگ مرے خاندان کے

.....

ہم زباں رکھتے ہیں مُنہ میں، یہ خبر رکھتے ہوئے
مُدّتوں دانستہ ہم کو بے زباں رکھا گیا

.....

جو مُنصف ہوا گر مُنصف تو پھر صحنِ عدالت میں
کفِ قاتل پہ دھبّہ بھی لہُو کا بول سکتا ہے

فضا کے خوف سے خاموش بیٹھے ہیں سبھی، لیکن
اچانک کوئی بچّہ بے ارادہ بول سکتا ہے

بگولے بھی ہماری بات کی تائید کرتے ہیں
زبانِ حال سے خاموش صحرا بول سکتا ہے

ریاض ندیم نیازی اس دنیائے خستہ حال کا عکاس ہے جہاں بے چارگی میں لوگ اپنے سپنے، لاشوں کے کفن، بیٹیوں کے گہنے اور رشتے فروخت کر دیتے ہیں اور:
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنی بھوک کی خاطر
پریشاں حال بچے اپنے بستے بیچ دیتے ہیں

.....

بلوچستان کی عظیم وادی کا یہ حساس سخن گو ایک عرصے سے اپنا تخلیقی سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ شکستہ اقدار کا یہ مرثیہ خواں سنہرے مستقبل کی بشارت لیے مسلسل عالمِ سفر میں ہے۔ اپنے عہد کا یہ ترجمان ثقافتی خزینے اپنی پشت پر دھرے سراپا غزل خواں ہے اور نت نئے مضامین کا انبار لیے نئی منزلوں کی طرف رواں دواں ہے۔
ریاض ندیم نیازی وہ طائر ہے جو زمینی خُو بُو رکھتے ہوئے بھی اونچی اُڑان کا عادی ہے۔ اس کی چشمِ بصیرت میں ایک وسیع و عریض آسمان چھپا ہُوا ہے:
زمانہ اِس کو سمجھتا ہے اپنا افسانہ
ندیم کچھ بھی اگر ماجرا لکھوں اُس کا

.....

مہمان نوازی اپنے قبیلے کی ہے سرشت
رکھتے ہیں ہم ہمیشہ مدارات کا خیال

.....

وہ تھا خود اپنی ہی وسعت میں کتنا لامحدود
جو آسمان پرندے کی آنکھ سے نکلا

☆☆☆☆☆

اُردو ادب کی پری، خوشبو کی شاعرہ ''پروین شاکر''

عہد ساز شاعرہ پروین شاکر پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ مگر آج اُن کی فن وشخصیت کے حوالے سے میں اپنے عصر کے مقبول شاعر اعتبار ساجد کے مضمون کا اقتباس ضروری سمجھتا ہوں کہ ''پروین شاکر کو جس قدر میں نے دیکھا اور سنا ہے مجھے وہ ایک لفظ بھی فالتو بولتی نظر نہیں آئی۔ پروین، عبداللہ ہارون کالج میں میری ایک کزن کی اُستاد تھی۔ جب کبھی کراچی جاتا تو میری کزن پروین شاکر کے بارے میں بتاتی کہ میڈیم سٹاف سے الگ تھلگ کسی گوشے، کسی پیڑ کے نیچے تنہا کتاب خوانی میں مصروف ہوتیں۔ کلاس روم میں روایتی پروفیسرز کی طرح ڈانٹ ڈپٹ، رعب داب روکھے پن بہت شگفتگی سے کام نہیں لیتی تھی۔ ٹو دی پوائنٹ دھیمی مدھم اور سنجیدہ انداز میں گفتگو اور لیکچر انھیں دوسروں سے مختلف بناتا تھا۔ فیض احمد فیض بھی عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل رہ چکے تھے وہ بھی روایتی پرنسپلوں کی طرح رعب وبدبہ والے پرنسپل تھے۔ انتہائی مدھم اور ملائم لہجے کے سربراہ ادارہ تھے۔ بہت کم مسکراتے تھے اسی نسبت پروین شاکر پر بھی لاشعوری طور پر غالباً ان ہی کا اثر پڑا تھا۔ وہ بہت کم مسکراتی تھیں، ہنستی بہت کم تھیں، لباس سادہ مگر اچھا پہنتی تھیں، کام سے کام رکھتی تھیں۔''

پروین شاکر جس قدر کم آمیز اور خاموش طبع شاعرہ تھیں اُس قدر ہی اُس کے کلام میں جذبوں کی سچائیوں کے ساتھ پیدا ہونے والی لازمی شکست وریخت پر گریہ کے بجائے لطیف طنز کی عملداری بھی شامل تھیں۔ انھوں نے خاص پیچیدہ صورتِ حال کو شاعری بنایا ہے۔ ''نسوانی خاکے'' اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تاریخ ادب میں پہلی بار خواتین پر لکھے ہوئے خواتین کے خاکے پڑھنے کو ملتے ہیں۔ جس کو مرتب شاہد حنائی نے کیا ہے۔ مگر اس کتاب کے صفحہ نمبر ۹۱ پہ پروین شاکر کے حوالے سے بھی ایک خاکہ پڑھنے کو ملتا ہے۔ جس میں محترمہ سرفراز اقبال انہیں اپنے خاکے کے عنوان میں ''دُکھی عورت'' سے مخاطب کیا گیا ہے۔ جس میں وہ اپنی ملاقاتوں کا احوال بیان کرتے ہوئے کچھ اس طرح سے رقم طراز ہے

صدام ساگر

کہ "سچ کہلوانے نے اُس گڑیا سی شاعرہ کو زندگی میں ہی تنہا کر دیا تھا۔ وہ تمام عمر محبت اور انا کی جنگ لڑتی رہی۔ نہ جانے وہ کسی ایک جذبے کو بھی پا سکی یا نہیں۔ کئی لوگوں کی خوش بختی اور بدنصیبی قدم قدم ساتھ چلتی ہے۔ بس پروین شاکر کا یہی مقدر تھا۔"

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اُس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رُسوائی کی

....

پروین شاکر ۲۴ نومبر ۱۹۵۲ء کو کراچی کے ایک علمی اور ادبی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والدِ گرامی سید ثاقب حسین خود بھی بہت کمال کے شاعر تھے اور "شاکر" تخلص کرتے تھے اسی نسبت پروین شاکر بھی اپنے نام کیساتھ "شاکر" تخلص لکھتی تھیں۔ انھوں نے پندرہ برس کی عمر میں شاعری لکھنا شروع کی ۔ کیونکہ انہیں شعرو شاعری کا شوق وذوق بچپن سے ہی تھا۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے نسوانی جذبات کی بہترین عکاسی کی ہے۔ جس میں انھوں نے نہ صرف اپنے جذبات کو پیش کیا بلکہ دوسروں کے دُکھ، درد کو محسوس کرتے ہوئے ان کے حقیقی جذبوں کو اپنی شاعری میں سمویا۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام "خوشبو" جب شائع ہوا تو اسے ملک گیر شہرت حاصل ہوئی۔ اس حوالے سے اعتبار ساجد بتاتے ہیں کہ "یہ ۸۰ء کی دہائی کا واقعہ ہے جب پروین کی پہلی کتاب "خوشبو" آئی تو اُس وقت میرا دوسرا شعری مجموعہ "آمد" منظرِ عام پر آیا تب پروین سے پہلے بہت سے شعرا اور ادبا اور نقادوں کے میرے بارے میں لکھی ہوئی سطریں پڑھی تو مسکرا کر کتاب کے صفحات اُلٹے پلٹے پھر ایک فقرہ کہا" ایسی شاعری کو اتنی آرا یساکھیوں کی ضرورت نہیں تھی۔" پروین شاکر بے حد نرم دل خاتون تھیں۔ ان کے اندر ہمدردی کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے ان کی شاعری میں جہاں محبت، عورت اور اقدار کا گراں قدر احساس موجود ہے وہاں ان کی شاعری میں دُکھ اور حزن کی کیفیت بھی ابھر کر سامنے آتی ہے۔ جبکہ ماں کے جذبات، شوہر سے ناچاکی اور علیحدگی، ورکنگ وومن کے مسائل کو بہت خوبصورتی سے اپنی شاعری میں قلم بند کیا ہے۔ اس لیے ان کی پوری شاعری ان کے جذبات اور دردِ کائنات کے احساسات کا اظہار لیے ہوئے ہیں۔

سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

....

پروین شاکر کو جھوٹ سے نفرت تھیں اسی لیے وہ زندگی بھر اپنے اشعار میں سچی بات کو صاف گوئی سے پیش کرتی رہی۔ ان کے شعری مجموعوں میں "خوشبو" (۱۹۷۶ء)، "صدِ برگ" (۱۹۸۰ء)، "خود کلامی" اور "انکار" یہ دونوں کتابیں (۱۹۹۰ء) میں منظرِ عام پر آئی۔ اس کے بعد "ماہِ تمام" (۱۹۹۴ء) میں شائع ہوئی۔ ان تمام مجموعوں میں جتنی اچھی غزلیں کہیں اتنی ہی اچھی ان کی آزاد نظمیں بھی پڑھنے کو ملتی ہے۔ اسی لیے خوبصورت لفظوں کا استعمال ان کے کلام کا

وصف رہا ہے۔ انھوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ کالم نگاری کے بھی جوہر دکھائے مگر اُنھیں کالم نگاری سے زیادہ شاعری میں بہت دلچسپی تھیں۔ ان کی شاعرانہ عظمت کا کھل کر اعتراف اُس دور کے بڑے بڑے ادیبوں، شاعروں نے بھی کیا جن میں احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، جمیل الدین عالی اور علی سردار جعفری وغیرہ شامل ہیں۔ پروین شاکر نے پاکستان ٹیلی وژن اور ریڈیو پاکستان پر میزبانی کی حیثیت سے پہلی بار جلوہ گر ہوئیں۔ انہیں پانچ بڑے ادبی انعامات واعزازت سے بھی نوازا گیا جن میں خوشبو کے لیے ۱۹۷۸ء میں آدم جی ایوارڈ جو پاکستان میں ایک قومی سطح کا اعزاز ہے، ۱۹۸۵ء میں علامہ اقبال ایوارڈ، ۱۹۸۶ء میں یو ایس آئی ایس ایوارڈ اور فیض احمد فیض ایوارڈ کے علاوہ انہیں بہت قلیل متاعِ حیات میں وہ کارنامے سرانجام دیئے جن کی بدولت ان کو پرائیڈ آف پرفارمنس کیساتھ ساتھ ''خوشبو کی شاعرہ'' کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔ یہاں مجھے ان کی مشہورِ زمانہ غزل کا مطلع یاد آرہا ہے کہ:

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی
اُس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

اسی غزل کا تیسرا شعر دیکھیے کہ:

وہ کہیں بھی گیا، لوٹا تو مرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی

.....

محبت کی خوشبو کو شعروں میں سمو کر بیان کرنے والی منفرد لہجے کی یہ شاعرہ ۲۶ دسمبر ۱۹۹۴ء کو اسلام آباد اپنے آفس جاتے ہوئے ٹریفک حادثے میں ۴۲ برس کی عمر میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔

مر بھی جاؤں تو کہاں لوگ بھلا دیں گے
لفظ میرے مرے ہونے کی گواہی دیں گے

.....

پروین شاکر کی وفات کے بعد ان کا ایک مجموعہ ''کفِ آئینہ'' ان کی ہمشیرہ نسرین شاکر نے شائع کروایا۔ جنھیں ادبی حلقوں میں بے حد پذیرائی ملی۔ محترمہ نسرین شاکر بتاتی ہے کہ ''اس مجموعہ کا نام وہ اپنی زندگی میں خود ہی تجویز کر چکی تھیں اور مکمل بھی۔ مزید یہی بھی کہا کہ ہم ہر سال اُن کی برسی پر اُن کی یاد میں ''پروین شاکر'' ایوارڈ کی تقریب بھی منعقد کرواتے ہیں۔'' آخر میں جاتے جاتے پروین شاکر کو خراجِ تحسین کے طور پر اپنی نظم کے اشعار پیش کرتا اجازت چاہوں گا۔

وہ پروین شاکر تھیں رب کی رضا پر
ہمیشہ تھا جس کا بھروسہ خدا پر
کھلاتی رہیں غنچے شعر و ادب کے
بچھاتی رہیں خوشبوئیں جو صبا پر
بہت خوب صورت تھیں لہجے کی مالک
زمانہ تھا نازاں غزل کی ادا پر
بہاروں میں خوشبو لُٹانے کو آئیں
اُنھوں نے کئی گیت لکھے ہوا پر
وہ اُردو ادب کی پری بن کے اُتری
ستارے چمکتے تھے جس کی ردا پر
اُنہوں نے شکایت نہیں کی کسی سے
بھروسہ تھا جس کو ہر اک کی دفا پر

☆☆☆☆☆

آزاد مہدی مکمل آزاد مہدی (ہائے ہائے ہائے)

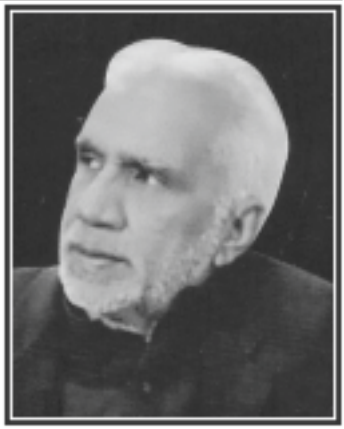

آزاد مہدی سے پہلی ملاقات کب ہوئی کہاں ہوئی اور کیوں ہوئی یہ سب سوچ کر میرے رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں مگر یہ پہلی ملاقات ہی ایسی سر چڑھ کر بولی، کہ میں خود بھی پکار اٹھا، باوا جی ہائے ہائے ہائے

میری اُن تین ہائے میں پہلی ہائے آزاد مہدی کے ناولوں پر ہے دوسری ہائے اس کے افسانوں پر ہے اور تیسری ہائے اس کی شخصیت پر ہے

باقی نظموں کی کتاب ایک نامکمل نفرت پر بہت ساری ہائے ہائے ہے مجھے اور کتنی بار یہ ہائے ہائے ہائے، کہنا پڑے گی یہ اللہ ہی جانتا ہے یا اس کا آزاد بندہ آزاد مہدی آزاد مہدی ایک شادی شدہ ریٹائر سرکاری ملازم ہے کسی زمانے میں یہ نوجوان رائٹر تھا، یہاں مجھے نوجوان سے پہلے خوبرو بھی لکھنا چاہیے تھا، مگر جب شادی شدہ لکھ دیا تو خوبرو کہنے کا کوئی جواز نہیں ہاں ہم اس کو موجود حالت میں دیکھنے کے بعد خوبرو نوجوان کہہ سکتے ہیں آزاد مہدی کو سرسری دیکھیں تب بھی یہ اتنا ہی بے وقوف نظر آتا ہے جتنا غور سے دیکھنے پر۔ اگر ہم اس کو بنا ہوا بے وقوف نہ بھی سمجھیں تب بھی یہ ایک سائیں لوگ ضرور لگتا ہے مگر یہ سائیں لوگ نہیں صرف سائیں ہے، اور وہ بھی وہ والا سائیں۔

اب آپ سوچیں گے کہ وہ والا سائیں کون

اعجاز رضوی

سا ہوتا ہے تو جناب یہ وہ سائیں ہے جو ایک ویران سڑک پر دنیا و مافیہا سے بے خبر ننگ دھڑنگ لیٹا تھا کے راہ چلتی ایک آزاد خیال ہیومن رائٹس کی رکن خاتون نے اُسے دیکھا اور ترس کھا کر پہلے اس نے سائیں کے بدن کو اچھی طرح صاف کیا، پھر کچھ دیر ہاتھ پاؤں دبائے، اور پھر کافی و شافی خدمت کے بعد اپنی چادر اس پر ڈال کر جانے لگی تو بے خود سائیں نے آنکھیں کھولیں اور پکارا گل سن اے نیک دل خاتون یاد رکھیں اسی سائیں ہوندے آں تے اتھے ہی ہوندے آں میں نے یہ واقعہ اس لیے سنایا کہ کچھ لوگ آزاد مہدی کو سائیں لوگ سمجھ رہے ہیں وہ صحیح سمجھ رہے ہیں۔ کہ آزاد مہدی بھی اپنی ہر شافی خدمت کے بعد نعرہ لگاتا ہے کے اسی سائیں ہوندے آں تے اتھے ہی ہوندے آں ایک زمانہ تھا جب یہ بورڈ آف انٹرمیڈیٹ میں ملازم تھا۔ آزاد مہدی شکل صورت سے انگلو انڈین لگتا ہے اگر یہ اپنی چوڑی پیشانی پر پٹی باندھ کر اس میں کسی شتر مرغ کا پر لگالے تو باقاعدہ انگلو انڈین شہزادہ لگے، اس کے سر پر ہونے والے بالوں نے آج کل اس کی گدھی پر جمع ہو کر ایک سفید پرچم کی صورت اختیار کر لی ہے، اور لگتا ہے جیسے یہ پیچھے آنے والوں کو صلح کا پیغام دے رہا ہے۔

یہ دفتر جاتے ہوئے بھی اتنا ہی اُداس لگتا تھا جتنا دفتر سے آتے ہوئے بدن پر پینٹ اور ٹی شرٹ اور پاؤں میں جوگر پہنے یہ کوئی بزرگ انگریز لگتا تھا اور انگریزوں کی طرح ہی سوچتا تھا۔ فارم ہاؤس ہو فونٹین پن ہو رائیٹنگ ٹیبل ہو ایزی چیئر ہو الارم بجے تو لکھنا شروع کر دے، پھر چائے کا وقفہ ہو پھر یہ کسی دور افتادہ ریل کی پٹڑی پر خراما خراما چلتا ہوا کسی ویران پلیٹ فارم پر پہنچے اور ناول کا دوسرا باب سوچے اور واپس آ کر بیگم سے وہ باب ڈسکس کرے، اور بیگم کہے او مائی گارڈ تسی جینیس او، اور یہی ایک فقرہ ہے جو اس نے کبھی نہیں سنا، آزاد مہدی راوی کنارے کا باسی ہے اس لیے اسے اوبلی مگرمچھوں سے ڈر نہیں لگتا، یہ آپ کو سرِ راہ مل جائے تو بہت محبت سے ملتا ہے۔

باوا جی

خیر ہووے ماشاءاللہ لو فیر مولا نے کرم کیتا جی اج ملاقات ہوگئی ہے بس ریڈی ہو جاؤ، میرا نواں ناول آن والا اے تسی کچھ لکھنا جے، پھر اچانک اکتاہٹ کا شکار ہو کر کہتا ہے لو فیر ملاقات ہووے گی، نہیں تسی چلو دوسرا کچھ کہنا چاہیے تو یہ بڑی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا ہے چلو چلو پوڑیاں اس پاسے نیں اُتر جاؤ میں

شعر نہیں فکشن سوچنا اے چلو چلو

آزاد مہدی کے والد جراحت کے شعبہ سے وابستہ تھے اور علاقہ کے بڑے بڑوں کی چیچیں نکلوانے میں ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ آزاد مہدی کو بھی یہ چیچیں نکلوانے کا فن ورثہ میں ملا ہے اسی لیے اس کی نظمیں اور ناول پڑھتے ہوئے قاری کی چیچیں نکل جاتی ہیں۔ آزاد مہدی جدید ترین دانش مند نثر نگار ہے اور جدت کو ہی پسند کرتا ہے، ایک بار کسی نے لطیفہ سنایا کہ ایک اُستاد نے شاگرد سے کہا لفظ مطالعہ کو فقرے میں استعمال کرو تو شاگرد نے فوراً کہا، میری ماں کہتی ہے، جا منے نوں مطالعہ لیا، آزاد مہدی نے لطیفہ سنا تو بول اٹھا ہائے ہائے ہائے،

ذہین شاگرد اے فوراً ہی فقرہ بنالیا، کیوں شاہ جی میں کہا یار اے لطیفہ سی، آزاد مہدی نے مجھے غور سے دیکھا اور کہا، یار دسو تے صحیح بھئی اے لطیفہ اے،

بندہ اینوں وچوں فکشن لب دا پھردا اے، تے ٹائم ضائع کردا اے

آزاد مہدی پنجاب کی جم پل ہے، اُسی لیے یہ بابا بلھے شاہ، وارث شاہ شاہ حسین سے زیادہ برناڈ شا، برٹرنڈ رسل، ٹالسٹائی والٹر، دوستوسکی چیخوف وغیرہ سے متاثر ہے، اور چاہتا ہے کہ اس کی زندگی میں برناڈ شا کا شاہ ٹالسٹائی کی ٹائی والٹر کا ٹر دوستوسکی کی وسکی اور چیخوف کا خوف اس کے ساتھ رہے اور اُن رائیٹرز کی طرح پورے ناول پر محنت سے پہلے فقرے بنانے پر محنت کی جائے یہ خود یورپ کے منظر نامے کو شاہدرہ کی بستی میں سجانا چاہتا ہے، اور خود بھی اُسی فضا میں رہتا ہے اور خوش ہوتا ہے کوئی کہے کہ میں یورپ کے دورے سے واپس آیا ہوں تو یہ فوراً کہے گا، باوا جی اچھی گل اے، میں وی کل مطالیاتی دورے تے گھکھڑ منڈی گیا سی، مقامی رائٹر، نے بڑا ویل کم کیتا، ویک اینڈ ٹھیک گزر گیا۔ فیر اولوگ چلے گئے باوا جی انہاں نے دکان وی تے کھولنی سی۔

یہ کسی ادبی فکشن میں جانے سے پہلے بہت تیاری کرتا ہے، تقریب اگر شہر میں ہو، تو صبح سے ہی بچے کو تیار کرتا ہے کے اج فیر میلہ لٹ کے آنا ہے، موٹر سائیکل وچ پٹرول پورا رکھنا۔ شہر سے باہر جانا ہو تو موسم کے مطابق تیاری کرتا ہے۔ ایک بار ادبی کانفرنس میں ہم مل کر اسلام آباد گئے تو میں اس کی تیاری دیکھ کر دنگ رہ گیا، اس نے نئے جوگر خریدے، دو پینٹ خرید کر اُن سے میچ کرتی ہوئی ٹی شرٹ لی اور گرم فر والا کوٹ بھی لیا، جس کو اس نے ہاتھ پر لگا کے رکھا اور لاہور سے جونہی ڈائیورو انہ ہوئی یہ سیٹ سے لگ کر سو گیا، اجمل نیازی نے مجھ سے پوچھا تیرا یار تے سو گیا، میں نے کہا نیازی

صاحب اس کو سونے دیں، واپسی پر اس نے سفرنامہ جو لکھنا ہے نیازی صاحب میری اس پر بات بہت خوش ہوئے اور ہنستے ہنستے اُسے اٹھا دیا اور بولے اٹھ جا یار لاہور آ گیا جے ___

پھر اسلام آباد میں اس نے کنونشن ہال کی لائبریری کے علاوہ ہر جگہ دیکھی، خاص طور پر کینٹین اور پھر واش روم، اس دوران جو بھی اُسے ملتا یہ کہتا

ہائے ہائے ہائے مزہ آ گیا۔ کسی نے پوچھا کس کی تقریر اچھی تھی تو یہ بولا، ___ مینوں کی پتہ کس دی تقریر اچھی سی، میں نے سفر دی گل کیتی جے سفر دا مزہ آ گیا، باواجی ہائے ہائے ہائے۔

یہ اپنی گفتگو میں بہت شیر ہوتا ہے، میں لعنت کرناں واں، او کی لکھ دا اے میرے تے اس نے لکھ دیتا ہے، پھر خود ہی ڈر جاتا ہے کہ کہیں کوئی مجھ پر بھی کھل کر نہ لکھ دے تو اسی صورت میں یہ، اپنے مزاج سے ہٹ کر بلند آواز لگاتا ہے شاہ جی، ذرا مہربانی فرمانا، ماڑا بندہ واں ذرا خیال کرنا۔

آزاد مہدی کے چلنے کا انداز ایسا بارعب ہے کے لگتا ہے باقاعدہ کسی کو تڑی لگانے جا رہا ہے مگر قریب آئے تو لگتا ہے، ترلا مارنے آ رہا ہے، یہ گفتگو کا آغاز بھی تڑی سے کرتا ہے اور اور ترلے پر ختم کرتا ہے۔ یہ زیادہ دیر اُردو نہیں بول سکتا اُردو بولنی پڑ جائے تو کچھ دیر بعد کہتا ہے شکریہ اُردو وچ گل کرندی معذرت پھر ٹیکا کر پنجابی بولتا ہے

اس کی چال اور ادبی چال چلن کو دیکھتے ہوئے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ سانچوں میں ڈھلے ہوئے فقرے لکھنے والا، واحد رائٹر ہے آزاد مہدی آنے والی نسل کا ہیرو ہے اور آنے والے وقت میں نوجوان نثر نگار فخر سے کہیں گے کہ ہم آزادی مہدی کے انداز میں لکھتے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو میں پہلا بندہ ہوں گا، جو پورے یقین سے کہے گا کہ نثر کو اتنی سنجیدگی اور پاکیزگی کے ساتھ لکھنے والا، رائٹر آزاد مہدی ہے، اور یہ جواب میں کہے گا، شاہ جی کی فقرہ بول گئے ہو۔ ہائے ہائے ہائے

اور میں اس کی طویل یورپی یونین والی گفتگو سے بچنے کے لیے کہوں گا، توں وڈا رائٹر ایں، یہ پھر کہے گا باواجی ہائے ہائے ہائے کیا بات اے، اور میں کہوں گا۔ یار آزاد مہدی تیری دنیا وڈی اے

ایسی معمولی شاعر بندہ آن
اللہ تینوں تیری بنائی دنیا وچ خوش رکھے
___ توں نثر لکھن والا مشکل کم کردا رہیں نالے ہمیشہ بول دا رہیں کہ باواجی ہائے ہائے ہائے۔

☆☆☆☆☆

غزل

صبح عروج کی راہ نہ لگنا، شام زوال نہ کرنا
عشق سفر کرنا، لیکن سورج کی چال نہ کرنا

اپنے عکس نگاہ میں رکھنا میرے آئینے میں
مست تم اپنی دھن میں رہنا میرا خیال نہ کرنا

میری بات پہ میری کوئی بات نہ یاد دلانا
مجھ کو جیتنے آنا لیکن نطق کو جال نہ کرنا

ہنستے ہنستے کہہ جاتے ہو، تم بھی ساری باتیں
میرے وار پہ اپنے آگے میری ڈھال نہ کرنا

اشک غزال بھڑک اُٹھے تو کس صحرا جا نکلیں
یہ دل اک وحشت کا گھر ہے، یہ پامال نہ کرنا

اپنی جوت جگانا خالد اپنے الاؤ بنانا
اپنے عشق میں میرے جیسا اپنا حال نہ کرنا

خالد احمد

غزل

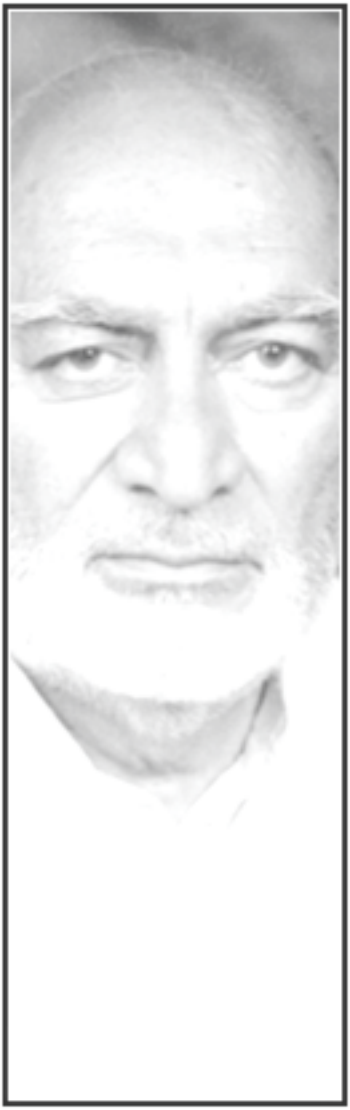

باغ میں بچے آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں
سارے مل کر ٹولی ٹولی کھیل رہے ہیں

شادی کا سامان بنا کر جانے والے
جاتے جاتے ڈولی ڈولی کھیل رہے ہیں

کوئی بھی انعام نہیں پہچان نہیں اب
جو بھی کھیلیں خالی جھولی کھیل رہے ہیں

کھیل تماشا اردو نے ہے خوب کیا
پھر بھی ہم ہیں ہندکو بولی کھیل رہے ہیں

پڑھنا لکھنا چھوڑ کے بچے شور کریں
کیسے جانے گولی گولی کھیل رہے ہیں

اب کے ثاقب کس کس کا میں نام دھروں
میرے دشمن خون کی ہولی کھیل رہے ہیں

آصف ثاقب

غزل

بازار و باغ بند، مکین و مکان بند
جائے یقین بند، ہوائے گمان بند

اب خامشی نے اور بڑھایا ہے اُس کا خوف
وہ مطمئن تھا شہر کی کر کے زبان بند

دو حرف ہو گئے ہیں جو ازبر تو یہ لگا
مُٹھی میں جیسے کر لیا سارا جہان بند

اوروں کی کیا خود اپنے بھی دل کی سنی نہ بات
جھوٹی انا نے کر دیے کچھ ایسے کان بند

کرتی ہے ہر کسی سے جدا رنگ میں کلام
سچی سخن وری نہیں ہوتی نشان بند

دنیا سے رسم و راہ جدا دل سے ربط اور
باندھا ہوا ہے اس نے عجب درمیان بند

عالی حصارِ ذلت و عبرت میں کر دیے
کیا کیا جلالِ وقت نے دھرتی کے ڈان بند

جلیل عالی

غزل

اور جب کچھ نہ تھا بنانے کا
فیصلہ کر لیا بنانے کا

کیا سے کیا بن گیا ہے عجلت میں
ہم نے سوچا تھا کیا بنانے کا

گھر میں ویرانیاں بسا لی ہیں
فائدہ کیا ہوا بنانے کا

مسئلہ گم رہی پہ چھوڑ دیا
دشت میں راستہ بنانے کا

لوگ جگنو سے کام لیتے ہیں
تیرگی کو ضیاء بنانے کا

کر رہا ہے یہ کام سرخ لہو
زردیوں کو ہرا بنانے کا

دل سلیقہ سکھاتا رہتا ہے
بد دعا کو دعا بنانے کا

اب ہنر کام کیوں نہیں آتا
حکم کو التجا بنانے کا

تجربہ ہے ہمارے پاس فقط
ایک شے بارہا بنانے کا

حرف نے مشورہ دیا آخر
انگلیوں کو دیا بنانے کا

ہم سے ہوتا نہیں گناہ کنور
آدمی کو خدا بنانے کا

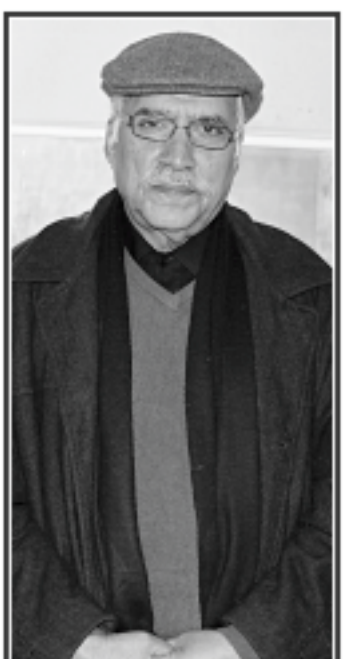

اعجاز کنور راجہ

غزلیں

کھڑے ہیں صف میں، ہویدا ہُوا قطار کا دن
کئی خمار کی شب ، آ گیا شمار کا دن

سمیٹیے رہِ گلشن میں بکھرے پتوں کو
خزاں کی شام ہُوئی اور گیا بہار کا دن

فرازِ عرش کی مخلوق نے قدم چومے
جو فرشِ خاک پہ آخر ہُوا سوار کا دن

خاور اعجاز

چلو اچھا ہُوا روزانہ کا دھڑکا ہُوا ختم
آئنہ ٹوٹ گیا اور تماشا ہُوا ختم

گرم بازاری رہی، خوں میں تھی جب تھی حدت
اَب دُکاں بند ہُوئی عمر کا سودا ہُوا ختم

ورنہ کب نیند کی آغوش سے فرصت مِلتی
آنکھ تو تب کھُلی جب خواب کا رستا ہُوا ختم

تمھیں نہ دیں گے کبھی زحمتِ خبرداری
کٹا کٹا نہ کٹا ہم سے خلفشار کا دن

ہماری بھی سنی جائے گی ایک روز کہیں
گذر ہی جائے گا تیرے بھی اختیار کا دن

چار دن خوب رہی رونقِ بزمِ ہستی
پھر اجل آ گئی اور وقت ہمارا ہُوا ختم

آنکھ مندتے ہی ہمیں بھول گئے ہیں احباب
زعم تھا صدیوں کا، دو پل میں ہی چرچا ہُوا ختم

غزل

نہ یہاں اور نہ وہاں، تم کسی گنتی میں نہیں !
سچ یہی ہے کہ میاں، تم کسی گنتی میں نہیں

عکس دراصل بڑھاتے ہیں تمہاری وقعت
ورنہ، آئینہ گراں، تم کسی گنتی میں نہیں

صورتِ حرفِ غلط تم تو زمانے میں رہے
جانِ من، جانِ جہاں، تم کسی گنتی میں نہیں

توڑ جاتا ہے کوئی روز تمہارے دل کو
یعنی اے دل زدگاں، تم کسی گنتی میں نہیں

اپنے اعداد میں جب مَیں بھی نہیں ہوں شامل
اے فلاں ابنِ فلاں، تم کسی گنتی میں نہیں

جانے کیوں اب مری تسبیح کے دانے مجھ سے
کہتے ہیں وقتِ اذاں، تم کسی گنتی میں نہیں

تم یقیں خود کو دلاتے رہو، چاہے جتنا
یہ تو ہے وہم و گماں، تم کسی گنتی میں نہیں

کھل کے برسو جو کہیں تم، تو کوئی بات بھی ہو
صورتِ ابرِ رواں، تم کسی گنتی میں نہیں

کون سے منصب و اعزاز کے حقدار ہو تم؟
اور کیا نام و نشاں؟ تم کسی گنتی میں نہیں

محفل آرائی میں کھو بیٹھو گے تم اپنا وجود
مت اُدھر جاؤ، جہاں تم کسی گنتی میں نہیں

آتشِ عشق نے خاشاک کیا ہے تم کو
کہہ رہا ہے یہ دھواں، تم کسی گنتی میں نہیں

میرا اعزاز، کہ ہوں صاحبِ قرطاس و قلم !
صاحبِ تیر و کماں، تم کسی گنتی میں نہیں !

تیرگی میں تو چمک اٹھتا ہے چہرہ اپنا
کہتی ہیں روشنیاں، تم کسی گنتی میں نہیں

گفتگو ہوتی ہے آئینے سے جب بھی میری
عکس کہتا ہے کہ ہاں، تم کسی گنتی میں نہیں

جو مجھے غم میں سکوں ملتا ہے تم کیا جانو
اے مرے چارہ گراں، تم کسی گنتی میں نہیں

اپنی موجودگی کرتے رہو چاہے ثابت
ہے یہی میرا بیاں، تم کسی گنتی میں نہیں !

میرے ہی دم سے تمہارا بھی سفر جاری ہے
ورنہ اے ہم سفراں، تم کسی گنتی میں نہیں

گلِ خندہ، یہی دو چار تمہارے دن ہیں
اور جب آجائے خزاں، تم کسی گنتی میں نہیں

سنتے آئے ہیں ہر اک شخص سے یہ بات نسیم
تم بھی کہہ دو نا میاں، تم کسی گنتی میں نہیں!

نسیمِ سحر

غزل

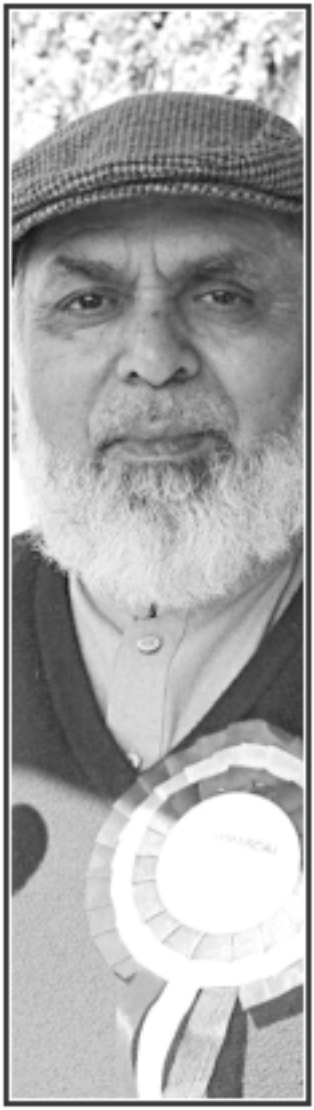

ڈاکوؤں سے کبھی بچتا ، کبھی مَرتا ہُوا ، میں
اِنہی رستوں سے شب و روز گُزرتا ہُوا ، میں

جانے کِس پَل کسی پستول سے گولی نکلے
اور پھر ریت کی مانند بکھرتا ہُوا ، میں

دے کے والِٹ ، گھڑی ، بائک ، نیا موبائل تک
خوف سے کانپتا ، سہما ہُوا ، ڈرتا ہُوا ، میں

گھر پہنچتا ہوں ، تو یکبارگی جی اُٹھتا ہوں
موت کا تا بہ نفس سامنا کرتا ہُوا ، میں

رہ گیا ہوں کسی تاوان کی پرچی بن کر
یک بہ یک سندھ کے کچّے میں اُترتا ہُوا ، میں

لاپتہ ، گُم شدہ افراد میں شامل ہوں انیس!
وہ اُفق پر کسی سورج سا اُبھرتا ہُوا ، میں

محمد انیس انصاری

غزل

جلتے ہوئے جب اتنے زمانے لگے مجھے
پھر یہ ہُوا کہ شعلے بجھانے لگے مجھے

گذرا ہوں بے شمار المیوں سے عمر بھر
جتنے بھی غم نئے تھے پُرانے لگے مجھے

بے انتہا تھیں بے سروسامانیاں مری
اجڑے ہوئے بھی آ کے بسانے لگے مجھے

آنکھوں نے چین سے مجھے سونے نہیں دیا
خود اپنے خواب جب نظر آنے لگے مجھے

اس کے بغیر عمر گذاری تو یہ ہُوا
احوالِ حسن و عشق فسانے لگے مجھے

ہونا تھا مجھکو عشق میں برباد ہو گیا
ہجر و وصال صرف بہانے لگے مجھے

صفدر صدیق رضی

غزل

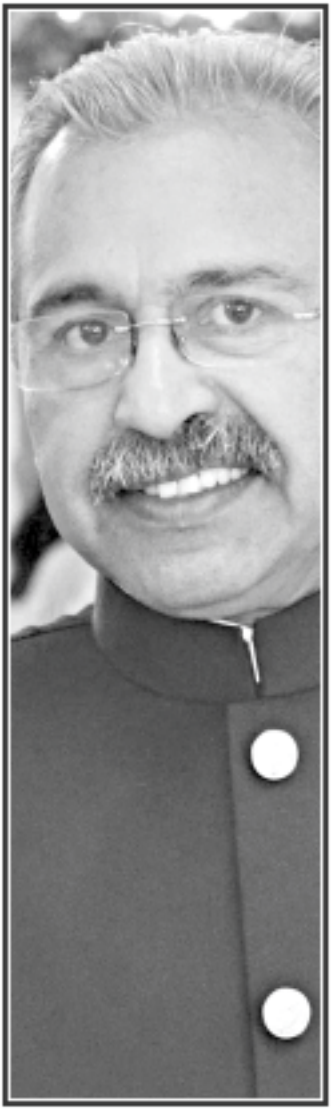

جہاں دل تھا لہو ہے
محبت سُرخ رُو ہے

کمی تو نے بھی کب کی
عُدو تو پھر عُدو ہے

قیامت سے نہیں کم
جو منظر کُوبکُو ہے

سنو تو خامشی کی
دہائی چار سُو ہے

ہے طوفانِ بلا اور
چراغ آرزو ہے

دلِ شجرِ بریدہ
طلب گارِ نمو ہے

خود اپنے ہاتھ راحت
بشر کی آبرُو ہے

راحت سرحدی

غزل

گلشن کا حُسن پُھول کا شعلہ سفر میں ہے
ہر سمت اِک بہارِ سراپا سفر میں ہے

آہِ جگر نظر کا چمن سیلِ اشکِ غم
جاناں تری تلاش میں کیا کیا سفر میں ہے

شامِ غمِ فراق کا منظر عجیب تھا
اب تک متاعِ صبح تماشا سفر میں ہے

گردش سے آفتاب کی آتی ہے روشنی
سایا مقیم نور کا دھارا سفر میں ہے

اے کاروانِ شوق تُو رہبر سے درگزر
دل ساتھ ہے خیال کی دُنیا سفر میں ہے

آنکھوں سے بہہ رہی ہے شراروں کی آبشار
کہسارِ دل میں آگ کا دریا سفر میں ہے

کچھ بھی نہ کر سکیں یہ خزاؤں کی گردشیں
میں نے بہارِ شوق کو دیکھا! سفر میں ہے

صحرائے دل میں پھر ہوئی بانگِ درا کی گونج
سبطین کوئی صورتِ لیلیٰ سفر میں ہے

شاہ محمد سبطین شاہ جہانی

غزلیں

سُخن وسیلہ بنا اور مہک اُٹھے رستے
گلاب رُت کی بشارت لیے ہوئے رستے

بجھی بجھی تھی تمنّا اُداس منزل کی
ترے چراغ کی لَو سے دمک اُٹھے رستے

چہارسُو تھی خزاؤں کی حکمرانی مگر
صدائیں دیتی بہاروں سے آملے رستے

تری نظر نے دکھائے ہیں خواب چاہت کے
ترے خیال سے مہکے ہیں پیار کے رستے

انھی کے دم سے ہے دھڑکن میں اضطرابِ سخن
یہ حرف وصوت نے بخشے ہیں جو نئے رستے

نثار ترابی

اے حسنِ نرم خو! ترے رستے میں آئے ہیں
کچھ کر لے گفتگو ترے رستے میں آئے ہیں

مدت سے ہے دیارِ تمنّا لہو لہو
آ! بیٹھ روبرُو ترے رستے میں آئے ہیں

پھر دید کے گلاب بچھانے کے واسطے
اے شہرِ آرزو! ترے رستے میں آئے ہیں

کِھلتی نگاہ شوخ ادا دیکھنے کو ہم
شہوارِ رنگ و بو! ترے رستے میں آئے ہیں

پھر نشۂ بہار ہے خوشبو کی کھوج میں
پھر بھر کے ہم سبو ترے رستے میں آئے ہیں

رکھ لے ذرا سی لاج کہ تشنہ دہن ہیں ہم
لہراتی آب جو ترے رستے میں آئے ہیں

غزل

اقبال سروبہ

کہیں پر سنگِ نفرت اور کہیں بادِ شرر آئے
کسی شاخِ جنوں پر پھر بھلا کیسے ثمر آئے

جہاں ہر شخص اپنے خول کی تیرہ ردا میں ہو
وہاں زندانِ ظلمت میں کوئی کیسے نظر آئے

جسے اہلِ قلم میرے ملائک میں نہ لکھ پائیں
قیادت کے لیے اب تو کوئی ایسا بشر آئے

کہیں پر بال و پر ہیں اور کہیں اجسام کے ٹکڑے
عقابوں کی یہ بستی ہے کہاں اچھی خبر آئے

کھڑا ہوں ساحلِ عمرِ رواں پر آس یہ لے کر
کبھی اشکوں کی موجوں میں کوئی حرفِ گہر آئے

مرے دل میں یہی اقبال برسوں سے رہی خواہش
مری فصلِ لہو پر بھی کبھی تو کچھ ثمر آئے

غزلیں

ہزار ظلم کرو اس کا خواب زندہ ہے
وہ ایک شخص جو زیرِ عتاب زندہ ہے

کچھ اور دیر میں یہ رات ٹوٹ جانی ہے
جو اس کو توڑے گا وہ آفتاب زندہ ہے

وہ جس میں ذکر ہے ہجرت کے سارے زخموں کا
لہو میں لتھڑی ہوئی وہ کتاب زندہ ہے

جو اپنے خون سے لکھی ہمارے پرکھوں نے
اسی کتاب کا ہر ایک باب زندہ ہے

اگرچہ باغ تو خاشاک ہو گیا لیکن
کبھی جو دل میں کھلا تھا گلاب زندہ ہے

کسی بھی موڑ پہ چکرا کے گرنے والے ہو
تمھارا وہم ہے عہدِ شباب زندہ ہے

ہمارے بعد کوئی تو علم سنبھالے گا
جو ہم نے لینا ہے تم سے حساب زندہ ہے

ستم گروں کو بھی آخر فنا تو ہونا ہے
جوان پہ اترے گا فخری عذاب زندہ ہے

زاہد فخری

اسیرِ ہم بھی ہوئے رائگاں محبت کے
یہ زخم زخم نہیں ہیں نشاں محبت کے

ہمارے چاروں طرف نفرتوں کا جنگل ہے
دکھائی دیتے ہیں سب بدگماں محبت کے

ہم اپنے حاسدوں کے درمیاں چپ سے ہے
ہمیں ملے ہی نہیں ہم زباں محبت کے

اب اک ہجوم ہے جو طعنہ زنی کرتا ہے
کہاں گئے وہ سبھی رازداں محبت کے

اگر پلٹ کے ابھی آسکو تو آ جاؤ
یہ دن ہیں آخری اس ناتواں محبت کے

اک ایسا شہر بسانا ہے ایک دن ہم کو
جہاں ہوں پیار کی گلیاں مکاں محبت کے

ہزار ظلم کرو پھر بھی عشق زندہ ہے
کبھی نہ بدلیں گے فخری بیاں محبت کے

غزل

خورشید ربانی

اور تو کیا یہاں نہیں ہے
سایۂ آسماں نہیں ہے

زخم اور کھل گئے رفو سے
مہرباں ، مہرباں نہیں ہے

آسماں پر ہے اپنا تکیہ
سائباں ، سائباں نہیں ہے

موج در موج دھیان رکھنا
بادباں ، بادباں نہیں ہے

یہ کڑا وقت ہے زمیں پر
آسماں ، آسماں نہیں ہے

کس سے اب دل کی بات کہیے
سایہ بھی رازداں نہیں ہے

چپ ہے خورشید آسماں بھی
ایک تُو بے زباں نہیں ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خاک پر خاک کی ڈھیریاں رہ گئیں
آدمی اُٹھ گئے ، نیکیاں رہ گئیں

غزل

بے کار ایک کام کیے جا رہے ہیں ہم
جینا نہیں ہے پھر بھی جیے جا رہے ہیں ہم

آتا نہیں ہے بخیہ گری کا ہنر مگر
دامانِ چاک پھر بھی سیے جا رہے ہیں ہم

اس کو بھی اک وسیلہ مسرت کا جانیے
یہ جو پیالہ غم کا پیے جا رہے ہیں ہم

کشتِ امید کب ہو ہری کچھ نہیں پتا
نذرانہ آنسوؤں کا دیے جا رہے ہیں ہم

پتوار اور ناؤ سنبھالی نہیں گئی
الزام ساحلوں کو دیے جا رہے ہیں ہم

کٹتا نہیں اکیلے میں تنہائی کا سفر
سو، خود کو اپنے ساتھ لیے جا رہے ہیں ہم

آنکھوں میں اب تو اس کی نمی بھی نہیں رہی
وہ خواب جس کو یاد کیے جا رہے ہیں ہم

طالب انصاری

غزل

کسی سے کوئی رشتہ ہے نہ بندھن
کہیں لگتا نہیں اپنا ، خفا من

نہ اب فطرت کی وہ رنگینیاں ہیں
نہ اب جھرنوں کی باقی وہ چھنا چھن

بڑھاپے کی طرف سب گامزن ہیں
جوانی ہو ، لڑکپن ہو ، کہ بچپن

محبت ایک دردِ لادوا ہے
محبت ایک لاینحل سی الجھن

طبیعت دشت پیما ہے ازل سے
دلِ وحشی کو راس آئے نہ گلشن

کسی کی بے وفائی کا اثر ہے
رہی ترتیب میں دل کی نہ دھڑکن

بھلے لگتے نہیں ہیں شہر ، شوکت
سو برسوں سے ہے صحرا اپنا مسکن

شوکت محمود شوکت

غزل

کسی کے دل میں کسی کی زباں پہ رہتے ہیں
زمیں پر رہ کے بھی ہم آسماں پہ رہتے ہیں

کبھی تو خلدِ بریں میں تھا آشیاں اپنا
کہاں سے آئے ہوئے ہیں کہاں پر رہتے ہیں

نظر ہے ان کی زمین و زمان سے آگے
فقیر سے جو ترے آستاں پہ رہتے ہیں

اگرچہ خار ہیں گلزار سے نکالے ہوئے
ہمارے احساں ابھی باغباں پہ رہتے ہیں

دیا ہے ایک کے بدلے میں خونِ دل اپنا
ہزاروں قرض ابھی جسم و جاں پہ رہتے ہیں

رضا ٹھکانہ بنانا پڑے گا اور کہیں
خزاں کے سایے مرے آشیاں پہ رہتے ہیں

رضا اللہ حیدر

غزل

پھول اتنے ہیں سنبھالے نہیں جاتے مجھ سے
اور کانٹے بھی نکالے نہیں جاتے مجھ سے

باغ دشمن کا سہی ، دشمنی خوشبو سے نہیں
پھول نیزے پہ اچھالے نہیں جاتے مجھ سے

تیری یادوں کو میں محفوظ نہیں رکھ سکتا
خستہ صندوق سنبھالے نہیں جاتے مجھ سے

میری تنہائی نہیں چھوڑتی پیچھا میرا
بند کمرے کے یہ جالے نہیں جاتے مجھ سے

خود کو دنیا کے مطابق بھی بنایا لیکن
یہ گزشتہ کے حوالے نہیں جاتے مجھ سے

پوری ہوتی نہیں اپنی بھی ضرورت مجھ سے
دوست احباب بھی ٹالے نہیں جاتے مجھ سے

خود بخود لوگ چلے جاتے ہیں دل سے شاہد
ورنہ کوشش سے نکالے نہیں جاتے مجھ سے

شاہد اشرف

غزل

دن رات دل کو زخم دے نشتر لگائے جو
میرا حبیب وہ ہے کہ مجھ کو رلائے جو

شہرِ وجود ہے ترا یا ہے جہانِ کل
اک تجربہ نیا مجھے ہر دن کرائے جو

بدقسمتی سے مجھ کو محبت ہے ایسے سے
وعدے کے بعد وعدہ نبھا ہی نہ پائے جو

اب ایک ایسے یار کی کرتا ہوں میں تلاش
مجھ سے ملے بغیر بہت چھٹپٹائے جو

افسوس اس کی آنکھ سمندر ہے اشکوں کا
دنیا میں سب کے ہونٹوں کو ہنسنا سکھائے جو

سکھ چین کیا حیات ہی میں اس پہ وار دوں
ہر حال میں کلیجے سے اپنے لگائے جو

اک ایسا بے وفا ہے مرے ذہن میں بسا
کوشش کے باوجود بھلایا نہ جائے جو

وہ حسنِ بے پناہ مرا جانِ عشق ہے
مجھ کو تخیلات کی وادی میں لائے جو

ذکی طارق

غزل

مسعود احمد

دیوار پوچھتی رہی در کا اتہ پتہ
ملنا محال ہو گیا گھر کا اتہ پتہ

افسوس کتنی بار ہم واپس پلٹ گئے
شوریدہ سر سے پوچھ کر سر کا اتہ پتہ

جنگل میں ناچ ناچ کے بھی دل نہیں بھرا
کچھ مور پوچھتے رہے تھر کا اتہ پتہ

کرنا ہے کیا تلاش ہوا میں ادھر ادھر
کنج قفس سے پوچھ بے پر کا اتہ پتہ

کب سے تھا میرے ساتھ برابر کھڑا ہوا
ان آندھیوں کے بعد شجر کا اتہ پتہ

لے جانے والے لے گئے گودیں اجاڑ کر
پیڑوں کو بھی نہیں ہے ثمر کا آتہ پتہ

کیسا عجیب وقت ہے دریا غریب پر
کشتی بتا رہی ہے بھنور کا آتہ پتہ

مرضی ہے ناخدا کی کہیں بھی اتار دے
کب ہے مسافروں کو سفر کا آتہ پتہ

غزل

بھٹکنے کے سبھی مرحلے تمام ہوئے
خسارے سارے کے سارے ہمارے نام ہوئے

ہمارے پاس کوئی بھول کر بھی نہ آیا
کہ جن سے کام تھے ان کو ہی سب سلام ہوئے

ترے گماں بھی پہنچے یقیں کی منزل تک
مرے یقین بھی سارے خیالِ خام ہوئے

حضور غیروں سے ملتے ہو کسی قرینے سے
کبھی تو ان سے ملو جو ترے غلام ہوئے

نہیں ہے ان کو تمنا رہائی کی اب تو
قفس میں خوش ہیں کبھی جو بھی زیرِ دام ہوئے

ہماری بیگناہی اشتہار کیسے بنی
تمہارے شہر میں چرچے ہمارے عام ہوئے

چھپائے چھپتی نہیں ہے کسی طرح وہ خوشی
وہ آج بزم میں ہم سے بھی ہمکلام ہوئے

جلیل لمحوں میں کرتے ہیں سب کو وہ تسخیر
اور ایک ہم ہیں کہ اپنے نہ ہم سے رام ہوئے

احمد جلیل

غزل

میں زندگی منانے کہاں سے کہاں گیا؟
واں سے یہاں تک آیا، یہاں سے کہاں گیا؟

آج اِس جہان میں تھا تو کل اُس جہان میں
کچھ دن ہوئے میں دونوں جہاں سے کہاں گیا؟

باہر سے جھانکتا ہوں ، بتاتا نہیں مگر
ایک اک مکین کون و مکاں سے کہاں گیا؟

کچھ دن تمھارے کنجِ بدن میں گزار کر
بھولا ہی رہنے دو میں وہاں سے کہاں گیا؟

یہ بات جب کھلی کہ جب آواز پڑ گئی
آگے، میں اِتنا آگے، زباں سے کہاں گیا؟

اک شخص جو گیا ہے ، اُسی کو پتا نہ ہو
اک شہر تھا جہاں میں، جہاں سے کہاں گیا؟

وہ جو گلی کے راستے آیا گمان میں
جب آ گیا تو پھر وہ گماں سے کہاں گیا؟

اے منظرِ جہاں ، کبھی تُو بھی تو کچھ بتا
اک شخص میرے منظرِ جاں سے کہاں گیا؟

شاہین عباس

غزلیں

عشق سے توبہ، یہ آئندہ نہیں کرنا ہے
ایسے فرعون کو پھر زندہ نہیں کرنا ہے

اس کو کہہ دو کہ کسی اور کو مزدور کرے
خود کو اب عشق کا کارندہ نہیں کرنا ہے

اتنا ظالم ہے پنہ مانگتی ہے اس سے موت
دل کو اس دیش کا باشندہ نہیں کرنا ہے

بھیجنا ہے مجھے اس بار، خرد کو اُس پار
یہ جنوں اب کے نمائندہ نہیں کرنا ہے

لوٹ لیتا ہے یہ کم بخت سکون اور قرار
ہوش نے جوش کا تابندہ نہیں کرنا ہے

میرے ملنے سے نظر جس کی ندامت سے جُھکے
میں نے اُس شخص کو شرمندہ نہیں کرنا ہے

رانا سعید دوشی

خواہشوں کا غلام آدمی ہوں
خاص کب ہوں میں عام آدمی ہوں

دام ، چوگرد گیسوؤں کے ہیں
اور میں زیرِ دام آدمی ہوں

مجھ میں شیطان بھی ہے تھوڑا بہت
اور باقی تمام آدمی ہوں

ہوں محبت میں جنگ کا قائل
بر سرِ انتقام آدمی ہوں

مجھ پہ الزامِ بت پرستی ہے
حسن سے شاد کام آدمی ہوں

میں کہ مسجود ہوں ملائیک کا
قابلِ احترام آدمی ہوں

غزل

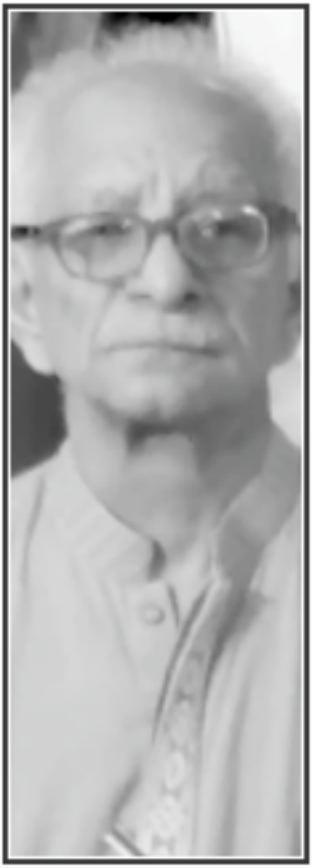

بوسیدہ پیراہن میں جو ہوش کی باتیں کرتا تھا
وقت نے فرزانوں میں دیکھا ایسا اک دیوانہ بھی

عشق میں کچھ کہنے سننے سے بہتر ہے خاموش رہو
چھوٹی چھوٹی باتوں کا بن جاتا ہے افسانہ بھی

دل کی سیری تو اسکی بزم میں ہی ہو جاتی ہے
اُس کو دیکھ کے بھر جاتا ہے آنکھوں کا پیمانہ بھی

اہلِ جنوں اور اہلِ خرد میں بعد ہے مشرق و مغرب کا
درد میں گم فرزانے کو کہہ دیتے ہیں دیوانہ بھی

دیکھ کے طاہر اک محرم کی اِس درجہ بیگانہ روی
سوچتا ہوں کیا اُس نے مجھ کو محفل میں پہنچانا بھی

طاہر ناصر علی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

حال دل کس طرح کہوں خالد
وہ مرا احترام کرتا ہے

غزل

اس تمنا کے آشیانے میں
جل گئی میں ، دیئے جلانے میں

کتنی صدیاں گزر گئیں اس کو
عرش سے فرش پر بلانے میں

میں نے نقشِ وفا بنائے جو
لگ گئے تم انہیں مٹانے میں

کتنی خوشیوں کا خون ہوتا ہے
بستیاں درد کی بسانے میں

کتنا مصروف خود کو رکھتے ہو
میری آنکھوں کو تم رلانے میں

دن کی رونق اجڑتی جاتی ہے
محفلِ شامِ غم سجانے میں

کس قدر شادمان ہوتے ہو
جان افروز کی جلانے میں

افروز رضوی

غزل

جو بات تیرے دل میں ہے اس کے الٹ نہ جا
وحدت کا رنگ چھوڑ کے خانوں میں بٹ نہ جا

یا کاغذی لباس میں باہر نکل نہ تُو
یا بارشوں کے خوف سے گھر کو پلٹ نہ جا

سورج کی طرح ذات کی کرنیں بکھیر دے
ذرّے کی مثل اپنے ہی اندر سمٹ نہ جا

رفتہ سے رابطہ ہو نہ آئندہ کی خبر
یوں لمحۂ رواں کے بدن سے لپٹ نہ جا

روشن بلندیوں کی تمنّا بجا ، مگر
آکاش کی طلب میں تو دھرتی سے کٹ نہ جا

اعجاز روشن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

راہ نما ہیں پھر آہٹیں
اے گمراہی ! چل دیکھ کر

غزل

وہی سپنا پرانا چاہتا ہوں
میں تیرے پاس آنا چاہتا ہوں

زمانے سے مجھے اتنی غرض ہے
کہ میں تیرا زمانہ چاہتا ہوں

مجھے بننا ہے اس منظر کا حصہ
پرندوں کو اڑانا چاہتا ہوں

قدیمی ہوں بہت اندر سے جیسے
سبھی کچھ میں پرانا چاہتا ہوں

محبت آزماتی ہے سبھی کو
محبت آزمانا چاہتا ہوں

کوئی تو ہو جو میرے ساتھ آئے
میں دیواریں گرانا چاہتا ہوں

زمانے کی اجازت ہو تو شوکت
ذرا سا مسکرانا چاہتا ہوں

افتخار شوکت

غزل

حسن پھیلا ہوا جہان میں تھا
میں کسی اور ہی کے دھیان میں تھا

امن کی پیشکش ہوئی مجھ کو
آخری تیر جب کمان میں تھا

میں نے سیکھا ہنر بغاوت کا
جب اکیلا ہی خاندان میں تھا

یوں نوازا بلندیوں نے مجھے
میں زمیں ہو کے آسمان میں تھا

کیسے رہتا میں ہر کہانی میں
میں کسی اور داستان میں تھا

اس کی منزل خلا سے آگے تھی
ایک پنچھی نئی اڑان میں تھا

ڈر رہا تھا شکستگی سے نوید
جسم ٹوٹے ہوئے مکان میں تھا

محمد نوید مرزا

غزل

یوں کبھی اُس کا سامنا نہ ہوا
پھر یہ درپیش مرحلہ نہ ہوا

تیری فرقت میں ہم رہے خاموش
ہم سے اظہار برملا نہ ہوا

آج بھی تیرا انتظار کیا
آج بھی کوئی معجزہ نہ ہوا

آپ اپنی مثال ہو تم بھی
تم سا کوئی بھی دوسرا نہ ہوا

وہ گیا تو سبھی چراغ بجھے
بعد اُس کے وہ سلسلہ نہ ہوا

ہم رہے ہیں ترے نشانے پر
پھر بھی تجھ سے کوئی گلا نہ ہوا

ہم بھی پھر لوٹ کر چلے جائیں
آج تک ہم سے فیصلہ نہ ہوا

طلعت شبیر

غزلیں

اس قدر قحط ہے، گرانی ہے
رائگانی سی رائگانی ہے

اس کی اب برسیاں مناؤ گے
حضرتِ عشق آنجہانی ہے

یہ جو ملنا ملانا ترک ہوا
یہ بھی اک طرح کی گرانی ہے

جو بھرا شہر لگ رہا ہے دشت
یہ ترے ہجر کی نشانی ہے

کٹ رہی ہجر اور ہجرت میں
لامکانی سی لامکانی ہے

اوصاف شیخ

نام لکھے تھے جن درختوں پر
چہرے کھلنے لگے ہیں شاخوں ہر

ہونٹ رکھتے ہیں پیڑ پر یہ لوگ
ہاتھ کلہاڑیوں کے دستوں پر

کوئی آیا نہیں ہمارے بعد
گھاس اگنے لگی ہے بنچوں پر

اب کہ رنگِ چمن بدلنے کو
ہم کو کھلنا پڑے گا شاخوں پر

کل بھی روتے تھے، کل بھی روئیں گے
آج ہنستے ہیں میری باتوں پر

آدمی ہو گیا پریکٹیکل
گرد جمنے لگی کتابوں پر

میں مسافر نہ یہ سفر اوصاف
دھول کیوں اڑ رہی ہے رستوں پر

غزل

بس ایک سانس کا چلنا ہے زندگی کیسی
نظر ہو نور سے خالی تو روشنی کیسی

عدو سے انس و مدارات باہمی کیسی
اس اک سوال پہ حد درجہ برہمی کیسی

یہ کھیل جان طلب ہے تو دل لگی کیسی
کفن نہ سر پہ بندھا ہو تو عاشقی کیسی

لہو کے ساتھ کوئی نام مستقل ہے رواں
بدن سے پھوٹ رہی ہے یہ سرخوشی کیسی

یہ کیسی آگ مری جاں کو سرد کرنے لگی
جلا رہی ہے بدن کو یہ چاندنی کیسی

کیا ہے ترکِ تعلق تو پھر یہ سب کیا ہے
یہ راہ و رسم ، یہ چاہت ، یہ دوستی کیسی

میں صرف کہنے کی حد تک ہی صنفِ نازک ہوں
جو بوجھ گھر کا اٹھاتی ہوں ، نازکی کیسی

جو گھر بسانا ہے، چپ چاپ ظلم سہنا ہے
ہوں اس کے پیر کی جوتی ، برابری کیسی

نہیں جو دل میں کوئی بات پھر سب کیا ہے؟
سپاٹ لہجے سے چھنتی ہے بے رخی کیسی

چلو اِسی کو ہی آغازِ دشمنی جانیں
ملال دل میں اگر ہو تو دوستی کیسی

خالدہ انور

غزل

ہم جو جنت سے نکالے گئے فتنہ کرتے
حکم تیرا ہے تو لوٹ آئیں گے سجدہ کرتے

اب تجھے روز نہ سوچوں تو بدن ٹوٹتا ہے
عمر گزری ہے تری یاد کا نشہ کرتے

معرکہ عشق کی حُرمت کا ہو یا بدر کا ہو
حالتِ جنگ میں رشتے نہیں دیکھا کرتے

ہم نہ ہوتے تو کوئی اور محبت کرتا
تُو نہ ہوتا بھی تو ہم تیری تمنا کرتے

تیرے دیدار کے لمحات بہت قیمتی تھے
ہم اگر آنکھ جھپکتے تو خسارا کرتے

آپ کو دیکھ کے لگتا ہے کہ میں نے دیکھا
کُھلی آنکھوں سے جو سپنا نہیں دیکھا کرتے

جانے والوں کو صدائیں نہیں دیتے ساگر
اشک واپس نہیں آنکھوں میں سمایا کرتے

محمد سلیم ساگر

غزلیں

زخم رِستے ہیں ہمارے رات بھر
جاگتے ہیں درد سارے رات بھر

تم نہیں تو کہکشاں کی اُوٹ سے
کون کرتا ہے اِشارے رات بھر

کیا قیامت ہے کہ دیتے ہیں فریب
بے سہاروں کو سہارے رات بھر

روشنی کے ایک پودے کے لئے
بوئے ہیں پلکوں سے تارے رات بھر

اَب اندھیروں کے سمندر میں سحر
ڈھونڈتا ہوں میں کنارے رات بھر

اکرم سحر فارانی

تقدیر میں لکھا نہ تھا فُرقت کے سوا اور
مطلوب طلب اور تھا طالب کو ملا اور

ہر شخص کی اَغراض کا معیار الگ ہے
رندوں کی صدا اور ہے زاہد کی صدا اور

کُچھ حُسن پہ مرتے ہیں تو کُچھ رنگِ حیا پر
صورت پہ فدا اور ہیں سیرت پہ فدا اور

وعدہ تو وہ کرتے ہیں نبھانے نہیں آتے
بیماری مجھے اور ہے دیتے ہیں دوا اور

ہر ایک صدا کار گدا گر نہیں ہوتا
دیدار کے طالب کا ہے اَندازِ نوا اور

گلشن کی رَوِش سے تو گزرتی ہیں یہ دونوں
صَرصَر کی جلن اور ہے خوشبُوئے صبا اور

محبوب کے دَر کا ہے طواف اِن کی عبادت
دیوانوں کے ہوتے ہیں رسول اور خدا اور

دل کھول کے بانٹیں گے محبّت کا خزانہ
گھٹتا نہیں بٹنے سے یہ ہوتا ہے سَوا اور

اِک شانِ شبِ غم ہے تو اِک جانِ سحر ہے
انجم کی چمک اور ہے سورج کی ضیا اور

غزل

مدّتیں بیت گئیں دوست! اُدھر سے ہو کر
لوٹ آیا ہے بشر شمس و قمر سے ہو کر

تیری خواہش میں کسی روز پلٹ آؤں گا
ساحلِ شوق پہ میں موجِ گہر سے ہو کر

لوٹ جاتا ہے ہمیشہ مرے باطن کی طرف
کوئی آنسو سا مرے دیدۂ تر سے ہو کر

تُو نے جو حکم دیا مجھ کو گزر آیا ہوں
اِک عجب ضبط سے میں خوف و خطر سے ہو کر

ہر طرف دُھند کا عالم ہے دُھواں ہے ہر سُو
کس طرف جاؤں ترے حسنِ نظر سے ہو کر

لوٹ جاتا ہے کسی دشتِ وغا کی جانب
ایک بادل سا مرے شہر و نگر سے ہو کر

اِک نہ اِک دن ترے آنچل کی طرف جائے گا
لمحۂ شوقِ طلب شام و سحر سے ہو کر

کم نظر لوگ بنائیں گے ہزاروں باتیں
تہی دامن جو گیا میں ترے دَر سے ہو کر

لوٹ آتا ہے مرے شانوں کی جانب اے نبیل
کوئی پنچھی کسی سرسبز شجر سے ہو کر

نبیل احمد نبیل

غزل

بنا مقصد بنا لالچ محبت کون کرتا ہے
ضرورت ختم ہو جائے تو عزت کون کرتا ہے

سنبھل کے چلنا پڑتا ہے یہی دستور دنیا ہے
زمیں پیروں سے کھسکے تو رعایت کون کرتا ہے

سبھی کو فکر ہے بھرنا ہے کیسے پیٹ کا دوزخ
یہاں اب قاتلوں کی بھی مزمت کون کرتا ہے

کسی کے پیار کا نشہ سا جاتا ہے سانسوں میں
بھلا رسموں رواجوں سے بغاوت کون کرتا ہے

یہاں سانسوں کی قیمت خود ادا کرنی پڑے سب کو
کسی کے اشک رونے کی حماقت کون کرتا ہے

سبھی سہمے ہوئے رہتے ہیں اپنے آپ میں ہر دم
ستم اور بربریت میں شکایت کون کرتا ہے

یہ ہم دیوانوں کو اس کا ہنر بس آ گیا عرفان
خموشی سے خموشی کی وضاحت کون کرتا ہے

عرفان صادق

غزل

ہائے ، دو طرفہ محبت کا بھرم توڑ دیا
اس نے صدیوں کی رفاقت کا بھرم توڑ دیا

مجھ کو مارا ہے اندھیروں کے حوالے کر کے
میرے قاتل نے عداوت کا بھرم توڑ دیا

نوک خنجر کی گواہی بھی نہ مانی اس نے
ایک منصف نے عدالت کا بھرم توڑ دیا

میں نے جس شخص کو اپنی تھی وکالت سونپی
آج تو اس نے نیابت کا بھرم توڑ دیا

بیچ رستے کے ہمیں چھوڑ کے جانے والو
تم نے میلوں کی مسافت کا بھرم توڑ دیا

تیری باتوں سے مجھے بغض کی بو آتی ہے
تو نے اے دوست امانت کا بھرم توڑ دیا

تم نے اس درد کو مصرعوں میں نہ باندھا ارشد
تم نے برسوں کی ریاضت کا بھرم توڑ دیا

ارشد محمود ارشد

غزل

اب مجھے اُس کے در و دیوار سے نسبت کہاں
دل تو ہے اپنا وہی اِس میں مگر چاہت کہاں

ہر گھڑی کی بے سکونی، ہر گھڑی کا اضطراب
رہروانِ عشق کی منزل کہاں، راحت کہاں

کھو گئی ہے زندگی بے غنچہ و گل کی بہار
غنچہ و گل تو سلامت ہیں مگر نکہت کہاں

اب حریمِ دل میں اِک طوفان برپا ہے مرے
اب میسر دل کو پہلے کی طرح خلوت کہاں

فاصلوں ہی فاصلوں میں جی رہے ہیں لوگ سب
بھائی بھائی کے دلوں میں اب بھلا قربت کہاں

اب مرا دل بھی ہُوا جاتا ہے کچھ صحرا بدوش
اور کچھ صحرا میں پہلے کی طرح وسعت کہاں

بجھ گئے ہیں نوجوانی کے سبھی روشن چراغ
اب وہ پہلو میں خلش، جذبوں میں وہ حدّت کہاں

نقش ہیں آبِ رواں میں آپ کے نقشِ قدم
پائے رنگیں سے الگ سجدوں میں اب لذت کہاں

میں تو اپنے آپ میں اُلجھا ہُوا ہوں اے ندیم
''کوک نے دو کوکلوں کو، اب مجھے فرصت کہاں''

ریاض ندیم نیازی

غزل

اب کیا انساں ہیں سر بسر سائے
جیسے پھرتے ہوں در بدر سائے

سائے ڈھونڈھے ہیں سائے پائے ہیں
ہم نے پائے ہیں عمر بھر سائے

گھر بہ گھر لوگ بستے جاتے ہیں
قریہ قریہ ہیں، گھر بہ گھر سائے

ساتھ ساتھ ان کے سائے رہتے ہیں
مجھ کو لگتے ہیں بام و در سائے

شہر پر شہر بنتے جاتے ہیں
ان میں بستے ہیں گھر بہ گھر سائے

اپنے فتنوں کے ہاتھوں مرتے ہیں
فتنہ پرور ہیں فتنہ گر سائے

اصل ان کی کہیں پہ ہے کہ نہیں؟
یہ جو آتے ہیں اب نظر سائے

تم نچن کو بھی پیڑ سمجھا ہے
وہ ہیں پیڑوں کے بے ثمر سائے

راجہ عبدالقیوم

غزل

اللہ کرے سب کا بھلا اب کے برس بھی
مخلوق ہے راضی بہ رضا اب کے برس بھی

عبرت کا نمونہ ہے فضا اب کے برس بھی
بارود لٹاتی ہے ہوا اب کے برس بھی

ہیں جھونپڑیاں خندہ بہ لب، قصرِ شہی پر
خائف ہیں بہم شاہ و گدا اب کے برس بھی

منظر ہے وہی ارض و سماوات کا پیہم
صورت ہے وہی ہوش رُبا اب کے برس بھی

دامن ہیں تہی، گوہرِ مقصود سے افسوس!
ہیں سُوئے فلک، دستِ دُعا اب کے برس بھی

جاری ہے یہاں ظلم و ستم، صورت ماضی
حاوی ہے یہاں جور و جفا اب کے برس بھی

وہ پیاس کی شدّت ہے کہ دم ٹوٹ رہا ہے
ترساتی ہوئی شوخ گھٹا اب کے برس بھی

اِک پھول سے خوشبو کی تفاوت ہے مسلسل
اِک گوشت ہے ناخن سے جدا اب کے برس بھی

صدیوں سے خرد جس کی گرہ کھول رہی ہے
پوشیدہ ہے وہ رازِ قضا اب کے برس بھی

نغمہ ہے دل و جاں سے کہیں دُور ابھی تک
نالہ نہیں منزل کو رسا اب کے برس بھی

حالات کی چکی میں سدا پستے ہوئے لوگ
ہیں منتظرِ روزِ جزا اب کے برس بھی

فیضان، مگر آس تو خوشیوں کی ہے قائم
ماحول اگر یوں ہی رہا اب کے برس بھی

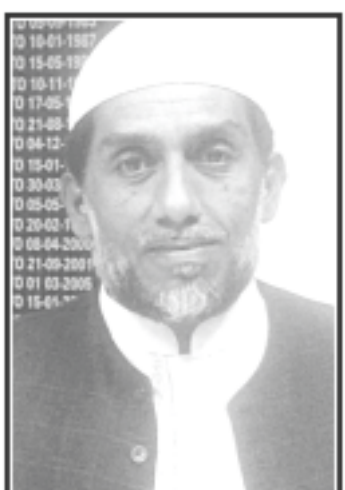

فیض رسول فیضان

غزل

سارے دیکھے بھالے لوگ
اجلی باتیں ، کالے لوگ

بوجھ اٹھائے جیون کا
جیون ڈھونے والے لوگ

چلتے رہنا لازم تھا
کیسے گنتے چھالے لوگ؟

تیرا پوچھنے آتے تھے
مشکل سے ہی ٹالے لوگ

ہم دونوں کا جھگڑا تھا
بیچ میں پھر کیوں ڈالے لوگ؟

صحن کی جب تقسیم ہوئی
لے کر آئے تالے لوگ

سانپ بھگا کر جنگل کو
بابر ہم نے پالے لوگ

احمد سجاد بابر

غزل

آرزو تھی تمھیں ہنستے ہوئے رخصت کرتے
اشک پلکوں پہ جو رکتے تو قیامت کرتے

تم کو معلوم نہیں جڑ سے اکھڑنے کا دکھ
تم کسی شہر، کسی گاؤں سے ہجرت کرتے

ہم کبھی زور ہواؤں کا نہ چلنے دیتے
جس قدر ہوتا چراغوں کی حفاظت کرتے

تم نے کچھ کہنے کی مہلت ہی نہ دی ورنہ
ہم بھی کچھ سرد رویے کی شکایت کرتے

لیے پھرتے ہیں وہ کانٹوں کی چبھن ہاتھوں میں
جن کی خواہش تھی کہ پھولوں سے محبت کرتے

چل کے آیا ہوں بہت دور انا سے اپنی
تم بھی دو چار قدم آنے کی زحمت کرتے

تم ہی رستے میں ہمیں چھوڑ گئے ورنہ
ہم بھی دنیا کے رواجوں سے بغاوت کرتے

دنیا والوں کے چلن سیکھ لیے ہیں سارے
تم وفا کرتے بھی تو حسبِ ضرورت کرتے

محمد اشرف کمال

غزل

مری آنکھوں میں منظر جاگتا ہے
پس گریہ سمندر جاگتا ہے

مری آباد ہے خوابوں کی دنیا
میں سوتا ہوں مقدر جاگتا ہے

کئی دن سے مری بستی پہ یا رب
یہ کیسا شور محشر جاگتا ہے

یہ نم آلود آنکھیں کہہ رہی ہیں
ترے پہلو میں پتھر جاگتا ہے

یہ کیسا خوف طاری ہے فضا پر
نہ جانے کیوں بھرا گھر جاگتا ہے

نہیں بدلا ابھی موسم وفا کا
اسے کہنا دسمبر جاگتا ہے

تری یادوں کو سینے سے لگائے
ترا دانش برابر جاگتا ہے

اعجاز دانش

غزل

فاصلے چھوڑ کے کدھر آتے
موڑ تھکتے تو پھر کے گھر آتے

نیکیاں کچھ تو ہم بھی کر آتے
اَشک آنکھوں میں جو اُبھر آتے

دل کا صفحہ تو صاف ہی ملتا
اس کی فہرست میں اگر آتے

شور ذرات بن کے جب بکھرا
کاش سینے کے چاک بھر آتے

حبسِ دوراں بہت کڑا ہے یا رب
ہوا کے دوش پہ بال و پر آتے

اُن خیالات کی ہے بات الگ
کاش اک بار چشم تر آتے

ظلم کے بن کا ہے عجب عالم
بن کے انسان جان ور آتے

کاش ہوتی ہمیں بھی فرصت سی
ہم ہی لمحوں کے گھر ٹھہر آتے

بات کرتے ہوئے بھی چپ سے تھے وہ
لفظ کچھ ہم ہی لب پہ دھر آتے

گر اجالوں میں ڈھل نہ پائے تھے
شب کی چادر میں ہم سنور آتے

دل کا صفحہ بھی صاف ہی ملتا
اس کی فہرست میں اگر آتے

اُن خیالات کی ہے بات الگ
کاش اک بار چشم تر آتے

دل کا اخبار ہے عجب جس کی
سرخیوں میں وہ نام ور آتے

اس کی فطرت ہے کچھ گرم خوسی
برف سورج میں جا کے بھر آتے

دھڑکنیں گر وہ سن نہ پائے تھے
چھید دامن میں دل کی کر آتے

ہم سناتے نہ حالِ دل احمد
خم جو پیشانی پر نظر آتے

علی رضا احمد

غزل

راہ امن اختیار کرتے ہیں
ہم تو سب سے ہی پیار کرتے ہیں

رخ پہ تیرے ہو لاکھ جھوٹ کا رنگ
ہم ترا اعتبار کرتے ہیں

سو نہ جائیں تھکن کے مارے ہوئے
ہم انھیں ہوشیار کرتے ہیں

ہم نے مانا کہ راستہ ہے کٹھن
مل کے پربت کو پار کرتے ہیں

اک ہمیں ہیں کہ دشمنوں کو بھی
دوستوں میں شمار کرتے ہیں

اٹھ سفر کے لیے نکل محسن
راستے انتظار کرتے ہیں

میتھیو محسن

غزل

ہر ایک ہی کا سب تو حبیب اللہ نہیں ہے
کاسب نہ کہوں ہاتھ پہ گر چھالا نہیں ہے

بدلے جو قیادت تو بہت کچھ ہے بدلتا
یہ سوچ ہماری ہے کوئی فتویٰ نہیں ہے

خوراک کی دیوی سے کرو رابطہ فوراً
اب تک کہ میسر جو تجھے حلوہ نہیں ہے

معصوم جوانی کو ملے تاج ولایت
ماتھے پہ اگر اس کے کوئی دھبا نہیں ہے

صحت کا تقاضا ہے طبیبوں کی ہدایت
آرام مگر ہم سے کبھی ہوتا نہیں ہے

حالات تو سب کے ہی امام اچھے نہ لگتے
ہر شخص مگر تیری طرح روتا نہیں ہے

مظہر امام

غزل نذر مجید امجد

بھلے ہم کو نہ تو مانے ، زمانے
رہیں گے ہم سے دیوانے ، زمانے

ہمیں پہچانتی ہے ایک دنیا
کبھی تو بھی تو پہچانے ، زمانے

خطر میں عزتیں ہیں ہر کسی کی
نہیں محفوظ کاشانے ، زمانے

ابھی تو بات ہی اتنی نہیں تھی
بنائے تو نے افسانے ، زمانے

اکیلا کب ہوں میں اس خاکداں میں
ہیں میرے ساتھ انجانے ، زمانے

جہاں آ جائے تیری دسترس میں
اگر تو ہم کو گردانے ، زمانے

پلا سکتے نہیں ہیں ایک جرعہ
ترے ہاتھوں کے پیمانے ، زمانے

شکنجے میں تو ہیں جانیں ہماری
ہوں کتنے اور نذرانے ، زمانے

سبھی کو بانٹ رکھا ہے تمھیں نے
بناتا ہے یہ ٹو، خانے ، زمانے

محمد افضال انجم

غزلیں

دم دعا میں اثر نہیں آتا
کوئی مقصود بر نہیں آتا
سامنے اک غبار پھیلا ہے
دور تک کچھ نظر نہیں آتا
عمر بھر ہم سفر رہے رستے
گھر میں آ کر بھی گھر نہیں آتا
سب خبر ہے اسے زمانے کی
بس یہاں بے خبر نہیں آتا
گھوم آتا ہے جو ستاروں تک
بھول کر بھی ادھر نہیں آتا

میں اسے روز گھر بلاتا ہوں
کہتا تو ہے مگر نہیں آتا
شاخچوں کو لہو پلاتا ہوں
دیکھنے سے ثمر نہیں آتا
ہم جئیں کس طرح سکندر اور
جینے کا بھی ہنر نہیں آتا

مرزا اسکندر بیگ

دریچوں سے پرندوں کی صدا آئے
ذرا سی کھڑکیاں کھولو، ہوا آئے

نکالیں در کوئی شب کی فصیلوں سے
کہیں سے روشنی کا سلسلہ آئے

عذابوں میں پڑی ہے زندگی، یا رب!
رہائی گر نہیں ملنی، قضا آئے

خیالوں میں جسے دن رات پوجا ہے
کبھی اس بے وفا کو بھی وفا آئے

وطن کی آبرو نیلام کی جس نے
کبھی اس بے حیا کو بھی حیا آئے

سکندر کاش بدلے رخ ہوا اپنا
پیاسوں کی طرف کوئی گھٹا آئے

غزل

اس اُجالے کا تعلق تو سیہ رات سے تھا
''یہی اندیشہ ہمیں پہلی ملاقات سے تھا''

بس چھٹی حس نے خبردار کیا اور مجھے
جس کا اندازہ تو پہلے بھی تری بات سے تھا

میں ہی نادان محبت میں سخی بن بیٹھی
اب یہ جانا کہ ترا واسطہ خیرات سے تھا

چھوٹی موٹی کئی خوشیاں تو دکھاوے بھر تھیں
آخری عمر تلک رشتہ تو صدمات سے تھا

فلسفہ جھوٹ کا اور سچ کا الگ اپنی جگہ
امتحاں اصل میں ہر شخص کا حالات سے تھا

مسکراتی رہی، آنکھوں کو کیا نم بھی نہیں
امتحاں اصل میں میرا تو مری مات سے تھا

بھول جانے میں بھلائی تھی ثمینہ اس کو
منسلک کون سا تا عمر مری ذات سے تھا

ثمینہ سیّد

غزل

کون سا اچھا ہے ریستوران، تیرے شہر میں
آ رہے ہیں کچھ مرے مہمان، تیرے شہر میں

صرف اپنے پاس تھی انگشتری یاقوت کی
بِک رہے تھے ہر طرف مرجان، تیرے شہر میں

بولنے پہ مار دیتی ہیں تری ایجنسیاں
بات کرنی بھی نہیں آسان، تیرے شہر میں

اِس طرح تو کانچ کے برتن نہیں ہیں ٹوٹتے
ٹوٹتے ہیں جس طرح پیمان، تیرے شہر میں

کر رہی ہے جستجو، یہ گھومتی ہے کُو بہ کُو
ڈھونڈتی ہے روح اطمینان، تیرے شہر میں

یہ تو میں ہی جانتا ہوں یہ مجھے ہی علم ہے
کر رہا ہوں جس طرح گزران، تیرے شہر میں

بیوقوفوں سے بھری گلیاں محلے دیکھ لے
اک سے بڑھ کر ایک ہے نادان، تیرے شہر میں

لوگ واقف ہی نہیں ہیں دل لگی کے نام سے
دل لگی کا ہے بڑا فقدان، تیرے شہر میں

میں تو اپنی بستیوں میں خامشی سے جا بسا
رہ گئے انصر مرے ارمان، تیرے شہر میں

انصر حسن

غزل

یہ ہم ہی جانتے ہیں جدائی میں یار کی
فرقت کی رات کس طرح آنکھوں کے پار کی

پتھرا گئے ہیں آنکھ میں منظر وصال کے
ہوتی ہے یار حد بھی کوئی انتظار کی

واپس وہ اپنے قریۂ جاں میں نہ آ سکا
دیکھی ہے شکل جس نے بھی اُس رہگزار کی

ملنا ہے درد ہجر کو اک راستہ نیا
کٹنی ہے فصل آرزو کے خواب زار کی

تاباں ہوا ہے آپ کے آنے سے گلستاں
آپ آ گئے تو جاگی ہے قسمت بہار کی

روشن ہوئے ہیں راستے شہرِ جمال کے
آمد ہوئی ہے آج کسی زرنگار کی

کانٹوں نے اپنے آپ کو خوں میں ڈبو لیا
پھولوں نے خوشبوؤں کی روش اختیار کی

شعروں کو میرے اس کا سراپا کہا گیا
میں نے تو کی نہ بات بھی نقش و نگار کی

چشمِ فلک سے صبحدم آنسو چھلک پڑے
کل آسماں نے ہجر کی شب اشکبار کی

برباد کر کے رکھ دیا صیاد نے چمن
آ کے کسی نے لی نہ خبر سوگوار کی

دلی کی طرح اُجڑا ہے آصف ہمارا دل
ہر سنگدل نے آ کے یہاں لُوٹ مار کی

آصف شفیع

غزل

ہر گل و برگ میں مجھ کو تیری خوشبو آئے
میری سوچوں میں تصور میں اگر تو آئے

پھیل جاتی ہے مہک تیرے بدن کی ہر سو
میرے آنگن کی ہوا تجھ کو اگر چھو آئے

ہجر کی دھوپ میں جب بھی میں جھلستا ہوں کبھی
میری جانب تیرے پھیلے ہوئے گیسو آئے

گرنے لگتا ہوں میں جب تھک کے تیری یادوں سے
تھامنے کو مجھے اس پل تیرے بازو آئے

بے قراری سے لگی رہتی ہے دل کو میرے
جانے کیوں چین نہ دل کو کسی پہلو آئے

تیرگی میرا مقدر ہی بنے کیوں اشفاق
میرے حصے میں بھی اک چھوٹا سا جگنو آئے

محمد اشفاق بیگ

غزل

مرحلہ وار ہی بنتا ہے جو گھر بنتا ہے
یعنی دیواریں اُٹھاتے ہیں تو در بنتا ہے

اینٹ گارے سے تو گھر ہم سے بنایا نہ گیا
تم بھی کر دیکھو میاں تم سے اگر بنتا ہے

میں جو تصویر بناتا ہوں کبھی فردا کی
کینوس پر کبھی خدشہ، کبھی ڈر بنتا ہے

کام آجاتے ہیں سب تھوڑی سمجھ بوجھ کے ساتھ
ہاں مگر خونِ جگر دیں تو ہنر بنتا ہے

کوئی قاتل کو مرے جا کے بتا دے اتنا
بیج کو مٹی میں بو دیں تو شجر بنتا ہے

سب قوانین بدل ڈالے گئے تھے ورنہ
ہے جہاں میرا وہاں آپ کا سر بنتا ہے

اس سے ظاہر ہوا بالائے خرد ہے کوئی
وہ مٹاتے ہیں مرا نام مگر بنتا ہے

دیکھ! پاتا ہے نمو خاک لحد سے سبزہ
دیکھ جو مارا گیا بارے دگر بنتا ہے

ٹہنیاں کاٹ بھی ڈالیں تو ثمر آتے ہیں
آپ کیا سمجھے تھے شاخوں میں ثمر بنتا ہے

گھاؤ دریا کے بدن پر کوئی ہوتا ہے ضرور
سطحِ دریا پہ جہاں کوئی بھنور بنتا ہے

راکھ ہو جاتا چمن ہم جو نہ ہوتے شاعر
درد جب شعر نہیں بنتا شرر بنتا ہے

تو نہیں ہے تو ترے شہر میں رہنا کیسا
سو ترے شہر سے اب اپنا سفر بنتا ہے

علمدار حسین

غزل

ہرا موسم ستم ڈھائے تو دل میں درد اُٹھتا ہے
اگر جانم بچھڑ جائے تو دل میں درد اُٹھتا ہے

تڑپتا ہے غزہ ہر روز اور فریاد کرتا ہے
نہ اُمّہ پھر بھی سُن پائے تو دل میں درد اُٹھتا ہے

دلدر دُور کرنے کے لیے آیا تھا جو حاکم
وہ وعدے سے مُکر جائے تو دل میں درد اُٹھتا ہے

جو غم سینے میں پلتا ہے رگوں کا خون پی پی کر
حدوں سے وہ گُزر جائے تو دل میں درد اُٹھتا ہے

بہت کُڑھتا ہے دل میرا جواں جب مانگنے نکلیں
نہ محنت کی کوئی کھائے تو دل میں درد اُٹھتا ہے

نہیں ہیں آج تک آئے وہ جس کو شعر کے معنی
مُقابل وہ اگر آئے تو دل میں درد اُٹھتا ہے

وہ جن چیزوں کی فرمائش ہے کرتی روز ہی بیٹی
اُنھیں شاہد نہ لا پائے تو دل میں درد اُٹھتا ہے

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

عزمِ نَو سے سفر کی سوچو
شب زَدو مِل کے سحر کی سوچو

کون دیتا ہے نوالے مُنہ میں
بے عمل لوگو ہنر کی سوچو

جس کی تعمیر میں خوں ہے شامل
اُس اُجڑتے بھی نگر کی سوچو

لگ چکی ہے یہ جڑوں کو دیمک
تم تمنا کے شجر کی سوچو

آتشِ غیر میں کُودے کیوں ہو؟
اپنے جلتے ہوئے گھر کی سوچو

جسارت خیالی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دل بھر آئے تو سمندر نہیں دیکھے جاتے
عکس ، پانی میں اُتر کر نہیں دیکھے جاتے

غزل

محبتوں کے ہمیں اُچھالوں نے مار ڈالا جناب والا
کوئی تسلی کوئی دلاسا کوئی حوالہ جناب والا

دکھائی دیتا ہے کس کو رقصِ ستم میں کچلا گیا مصلّی
سنائی دیتا ہے کس کو شعلوں کا شور کالا جنابِ والا

سفر کہے گا اُسے نہ کوئی کہ جس میں رہ کی صعوبتوں کا
چبھے نہ پیروں میں کوئی کانٹا بنے نہ چھالا جنابِ والا

پہن لیا ہے شباب شب نے ستارے ٹانکا ہوا لبادہ
ذرا سا مہکے گا گھپ اندھیرے میں اب اجالا جنابِ والا

کوئی ہدف ہے کوئی صدف ہے اُفق کے ہاتھوں میں لال دف ہے
اور اک مچھیرا ہے آب جُو میں اٹھائے بھالا جنابِ والا

عزیز عادل کی یہ دعا ہے خدائے ارض و سما کے آگے
زمانے بھر میں بس آپ ہی کا ہو بول بالا جنابِ والا

عزیز عادل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

غموں کا زہر کب سے پی رہے ہیں
نہ جانے کس طرح ہم جی رہے ہیں

غزل

لوگ وہ اپنے قبیلے کا پتا دیتے ہیں
جو سرِ راہ چراغوں کو جلا دیتے ہیں

سچے رب کو یہ لگائی ہے شکایت میں نے
لوگ سچ بولنے پر مجھ کو سزا دیتے ہیں

یار! اس بار مجھے ہنستے ہوئے رخصت کر
تیرے آنسو مری تکلیف بڑھا دیتے ہیں

یہ بھی معلوم کہ آتے نہیں جانے والے
اور ہم ہیں کہ تمہیں روز صدا دیتے ہیں

پہلے سنتے ہیں ترے ہجر کے قصے مجھ سے
پھر یہ تارے تری تصویر بنا دیتے ہیں

جب بھی ہوتی ہے اداسی مرے چہرے سے عیاں
دوست کرتے ہیں تراذکر ہنسا دیتے ہیں

ایسے لوگوں سے تعلق نہیں رکھنا مجھ کو
گھونسلے دیکھ کے بھی پیڑ کٹا دیتے ہیں

اس لیے لوٹ کے جاتا نہیں گاؤں اپنے
اس کے رستے مرے زخموں کو ہوا دیتے ہیں

موت نے چھین لیا جب سے جواں دوست اکمل
اپنے دشمن کو بھی جینے کی دعا دیتے ہیں

اکمل حنیف

غزل

اکرم جاذب

ہوا سے ایسے بگڑ جانا چاہیے تھا ہمیں
خزاں سے پہلے ہی جھڑ جانا چاہیے تھا ہمیں

اس اختتامِ الم ناک سے تو بچ جاتے
کسی بہانے بچھڑ جانا چاہیے تھا ہمیں

اسے کمال جو ضد توڑنے میں حاصل ہے
تو ابتدا ہی میں اڑ جانا چاہیے تھا ہمیں

فریب دے کے سمجھتے ہیں ، فتحیاب رہے
زمیں میں شرم سے گڑ جانا چاہیے تھا ہمیں

عجب نہیں تھا کوئی راہِ امن مل جاتی
حقوق کے لیے لڑ جانا چاہیے تھا ہمیں

فقط نصیب کو ہی کوسنے سے کیا ہوتا
گلے کسی کے تو پڑ جانا چاہیے تھا ہمیں

کسی کے بسنے کی جاذب یہی جو صورت تھی
تو کیا کہیں کہ اجڑ جانا چاہیے تھا ہمیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیکھا نہ ہمیں تُو نے خط و خال سے آگے
اِک شہر تھا ، اِس شہرِ مہ و سال سے آگے

غزل

اسی لیے تو تمہیں انوکھا لگتا ہوں
میں تکمیل سے پہلے چاک سے اترا ہوں

رنگوں کی پوشاک جو میں نے پہنی ہے
اپنی بے رنگی کو ڈھانپے رکھتا ہوں

تم بھی گواہی دو میری سچائی کی
میں بھی اپنے آپ کو کچھ سمجھاتا ہوں

دیکھتے ہیں دفنانے اب کون آتا ہے
مقتل سے میں لے کر لاشیں نکلا ہوں

جب سے پیار کے کچھ رستے ہموار ہو
سنورا سنورا اجلا اجلا رہتا ہوں

ہجر کی آگ میں جب تم جلتا چھوڑ گئے
تم کو اب کیا زندہ ہوں یا مردہ ہوں

کیسے دیکھے تُو منظر بربادی کا
اب میں تیرے شہر سے باہر رہتا ہے

پچھلی رات کو کون مجھے یاد آتا ہے
بن کر اشک جب آنکھوں سے میں بہتا ہوں

اس جانب تُو شاید بھول کے آ نکلے
گُل دانوں میں پھول سجائے رکھتا ہوں

تُو بھی اپنے گھر میں تنہا درد سہے
میں بھی اپنے گھر سے باہر تنہا ہوں

فرحاں آؤ ! بیٹھ کے ماضی دہرائیں
ماضی سے کٹ کر آدھا رہ جاتا ہوں

سرور فرحان

غزل

گرد اُڑی جہاں جہاں
ہم بھی گئے وہاں وہاں

عشق کی اپنی رہگزر
شوق کا اپنا کارواں

تم ہی ٹھہر گئے کہیں
وقت رہا رواں دواں

اُڑنے لگی ہے خاکِ پا
چھپنے لگا ہے آسماں

ڈال رہا ہے فاصلے
کون ہمارے درمیاں

چاند کہاں رہا تمام
خواب کسے ملے یہاں

آندھی کہیں چلی ظہورؔ
اُجڑا کسی کا آشیاں

ظہور چوہان

غزل

اپنوں کے بِنا گھر بھی مجھے گھر نہیں لگتا
قبروں میں بسے لوگوں سے اب ڈر نہیں لگتا

وہ زخم دیا ہے مجھے دزدیدہ نظر نے
اب یہ ہے کہ خنجر مجھے خنجر نہیں لگتا

ہر شانے کی قسمت میں کہاں گیسوئے برہم
ہر شاخ تمنا پہ گلِ تر نہیں لگتا

یہ کیسا جنوں، کیسی محبت ہے کہ یا رب
اس ہاتھ میں پتھر مجھے پتھر نہیں لگتا

میں خاک منش رکھتا ہوں فطرت میں جھکاؤ
یوں پائے تکبر سے مرا سر نہیں لگتا

خاموش صفت لوگ ہی رکھتے ہیں تلاطم
ہوتا ہے جو پرشور، سمندر نہیں لگتا

اصغر علی بلوچ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک قہقہہ کام کر گیا تھا
ہر شخص بہ چشمِ تر گیا تھا

غزل

ظاہری چاہتیں کتنی بازار میں
مطلبی قربتیں کتنی بازار میں

پیار کی بات تو کم کسی نے ہی کی
ہر طرف نفرتیں کتنی بازار میں

جن کا انسانیت سے تعلق نہ تھا
وہ ملیں صحبتیں کتنی بازار میں

دل ربائی کے سامان کیا سے کیا
عارضی راحتیں کتنی بازار میں

قتل ارمانوں کا دیکھا ہر موڑ پر
ہر طرف حسرتیں کتنی بازار میں

کتنے رنگوں میں جانے تجھے کیا خبر
لٹتی ہیں عزتیں کتنی بازار میں

جن کا عاصم نہ تھا بس خدا کے سوا
وہ ملیں عورتیں کتنی بازار میں

عاصم بخاری

غزل

چپ کا سکوت شورِ طلب سے سوا ہوا
پھر ان کہی میں ڈھل گیا میرا کہا ہوا

ساتھ اس کے ہی فرار ہوا تھا شعور بھی
پر جب میں لاشعور سے اپنے جدا ہوا؟

وہ بھی چرا کے لے گیا کم بخت کوئی رات
میں نے جو گھر میں زہر تھا لا کے رکھا ہوا

تو نے برے دنوں میں مدد کی تو ہے مگر
تجھ میں جو اپنا پن تھا، مرے دوست! کیا ہوا

اس نے ہی مجھ کو دی تھی سہولت جنون کی
اس نے مجھے چھوا تھا تبھی میں بڑا ہوا

حملہ کیا ہے عشق نے میری شناخت پر
پہلے میں اس کا عکس تھا، اب دوسرا ہوا

کیا دھیان آیا جانے کہ دنیا بدل گئی
میں بیٹھے بیٹھے ٹوٹ گیا جانے کیا ہوا

زندہ مجھے رکھا گیا، دے کے سزائے موت
پانی میں میرے زہر نہیں تھا ملا ہوا

میں اپنی پارسائی کا اب کیا ثبوت دوں
وہ ساتھ لے گئی مرا دامن پھٹا ہوا

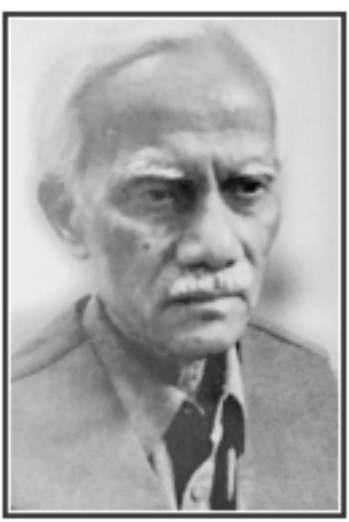

محسن اسرار

غزل

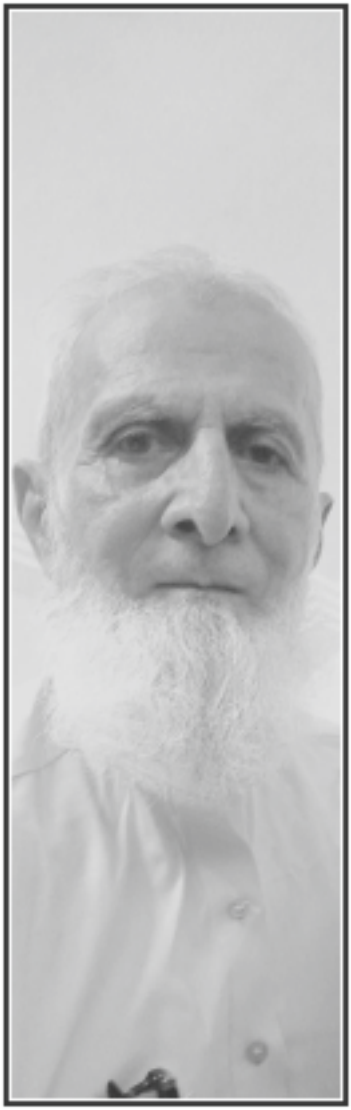

محبتوں کے شجر اگاؤں کہاں پہ ایسی زمیں کہاں ہے
ہے تیرے بندوں کی ملکیت سب خدایا تیری زمیں کہاں ہے

ہے آسمانوں کی وسعتوں پر بھی تیرے بندوں کا اب تو قبضہ
کسی کا کچھ ہے کسی کا کچھ ہے بتا رے میری زمیں کہاں ہے

خیال پر کب ہے منحصر کیا، ہے خوف خوابوں کی سرزمیں پر
سکوں کی دولت بہت جہاں تھی وہ پوری سب کی زمیں کہاں ہے

فسادِ فطرت میں کس نے ڈالا کہ پہلے دن سے ہوئے ہیں دشمن
یہ سلسلہ کب تلک چلے گا بھلا وہ اچھی زمیں کہاں ہے

تمہارے در تک جنہیں رسائی ہی بتا دو وہ اب کہاں ہیں
بھٹک رہے ہیں جو ایک مدت سے ان کی اپنی زمیں کہاں ہے

عجیب الجھن میں ڈال رکھا ہے دوستوں کی محبتوں نے
تمہاری سوچوں سے میل کھائے تمہارے جیسی زمیں کہاں ہے

ہیں اونچی اونچی عمارتیں اب کہ کھیت کھلیان ہیں کہیں اب
جہاں پہ ملتے تھے دوستوں سے وہ پیاری پیاری زمیں کہاں ہے

علاج وحشت کا ڈھونڈتے ہیں نئی نئی وحشتوں میں ہم کیوں
سکون پرور، وفا پرستوں کی پیاری دھرتی زمیں کہاں ہے

زمین زادوں کی بے قراری ہوس زدہ ہے عظیم اتنی
نئے جہاں کی تلاش میں ہے کہ اس کو پوری زمیں کہاں ہے

ابنِ عظیم فاطمی

غزل

کون جیتا تھا کون ہارا تھا
منزلیں راستے سجھاتی تھیں
ہاتھ آیا فقط خسارا تھا
منزلوں نے ہمیں پکارا تھا

مر گیا جو یہیں پہ رہتا تھا
کاش مٹی کے بین سن پاتے
مارنے والا بھی ہمارا تھا
گور میں کس کو جا اتارا تھا

شہر میں بولتے تھے سناٹے
اس جہاں کے لئے نہیں تھے تم
لال کیوں آسمان سارا تھا
تیرا سب سے جدا ستارا تھا

امن کے بن رہے تھے جو دعوی
خواب دیکھا ہی کیوں تھا آنکھوں نے
خون کا رنگ انکو پیارا تھا
دوش تو اس میں سب ہمارا تھا

منتظر تھا جہاں مسیحا کا
مڑ کے دیکھا نہیں دوبارہ پھر
ظلم ہر اک ترا گوارا تھا
قرض مٹی کا یوں اتارا تھا

جیت کا جشن تم مناتے رہو
جھوٹ جیتا؛ یقین ہارا تھا

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بات ہم کب تک کریں گے بات کا رُخ دیکھ کر
اے ہوا یہ بادباں کس پل اتارے جائیں گے

غزل

پیار میں کافی و شافی کی توقع نہ رکھی
اس نے بھی وعدہ خلافی کی توقع نہ رکھی

میں نے جی بھر کے محبت سے نوازا اُس کو
اور بدلے میں اضافی کی توقع نہ رکھی

کبھی لینا بھی پڑا کام تو جدت سے لیا
پر روایت سے منافی کی توقع نہ رکھی

اس سخی سے سبھی خیرات تو لے آتے رہے
کسی انسان نے کافی کی توقع نہ رکھی

میں کہ رکھتا ہوں کوئی علم بھی باریکیوں کا
درزی سے پارچہ بافی کی توقع نہ رکھی

ایک قاتل کو کیا ہم نے کُھلے دل سے معاف
ایک قاتل سے معافی کی توقع نہ رکھی

جب اجازت نہیں دیتی تھی مجھے یوں بھی قمر
اور بچوں نے بھی ٹافی کی توقع نہ رکھی

قمر نیاز

غزلیں

کسی چراغ کسی روشنی کو مت دیکھو
ہمارے ساتھ رہو اور کسی کو مت دیکھو

تم اپنے آپ کو دیکھو کہاں پہ بہتر ہو
ہمارے غم کو، ہماری خوشی کو مت دیکھو

ہمارے ساتھ بڑا مسئلہ ہے محفل میں
اُسی کے واسطے جاؤ اُسی کو مت دیکھو

ہمارے درد کو سمجھو اگر سمجھتے ہو
لبوں پہ آئی ہماری ہنسی کو مت دیکھو

تمھیں جو دیکھتا رہتا ہو رات دن آثم
نظر اٹھا کے اسی آدمی کو مت دیکھو

رمزی آثم

اپنی مشکل کو جو آسان سمجھ لیتا ہے
شہر سارا اُسے بھگوان سمجھ لیتا ہے

ایک دن بھی نہ اگر پیار سے دیکھوں اُس کو
عشق میں وہ اِسے نقصان سمجھ لیتا ہے

میں اُسے ساتھ سفر میں نہیں رکھتا اپنے
وہ اداسی کو بھی سامان سمجھ لیتا ہے

اتنا چپ چاپ میں رہتا ہوں کہ یہ سناٹا
میرے گھر میں مجھے مہمان سمجھ لیتا ہے

وہ محبت کو سمجھتا ہی نہیں ہے میری
اتنی سی بات تو نادان سمجھ لیتا ہے

غزل

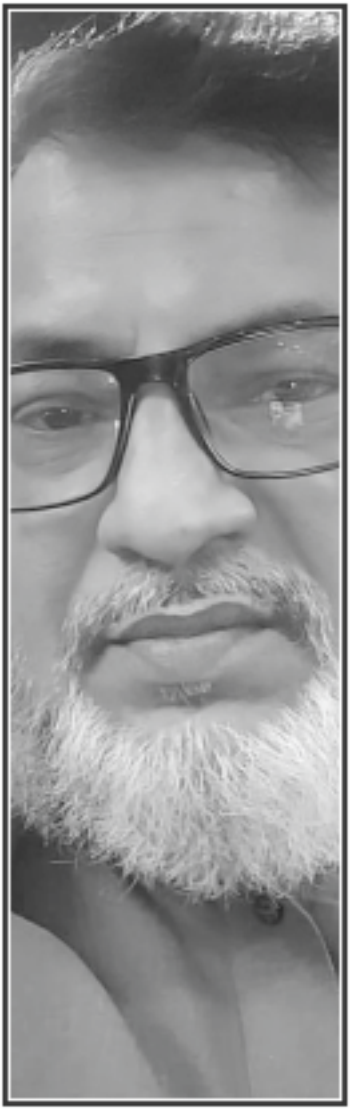

جان بھی مانگے تو چنچل کو نہ ٹالا جائے
دوستو پیار میں بے کل کو نہ ٹالا جائے

پھر کہیں ختم نہ ہو جائے چراغوں کی ضیا
اس لیے حشمتِ کاجل کو نہ ٹالا جائے

ذہن میں ہائے مچلتی ہے کسی کی خواہش
دل میں اٹھتی ہوئی ہلچل کو نہ ٹالا جائے

رات اور دن کا یہ چکر تو رہے گا یوں ہی
خوابِ امروز، چھپے کل کو نہ ٹالا جائے

بعض اوقات دوانے بھی اگل دیوے ہیں سچ
راز کی بات ہے پاگل کو نہ ٹالا جائے

پیاس ایسی ہے کہ دریا، ہی نہ ہو جائے سراب
اے خدا اب کسی بادل کو نہ ٹالا جائے

مثل کرنوں کے نکلتے ہوے خورشید کی ہر
زلفِ پیچاں کے بھی اک بل کو نہ ٹالا جائے

ہے ارادہ کہ بنوں دار کی زینت قیصر
پھر تو ہے فرض کہ مقتل کو نہ ٹالا جائے

رانا خالد محمود قیصر

غزلیں

یوں ادھورا قریب آؤ نہیں
یہ محبت فقط لگاؤ نہیں

مارے دے گی مری فراوانی
ہجر ہوں میں مجھے کماؤ نہیں

اس کی تصویر ہی بہت ہے مجھے
مجھ کو اب تم غزل سناؤ نہیں

میں ہوں اندر سے عشق کا حامی
مجھ کو اس کام پر لگاؤ نہیں

خوئے انکار تم پہ جچتی ہے
میرا احسان بھی اٹھاؤ نہیں

اس لیے ہے حیات یخ بستہ
اب ترے لمس کا الاؤ نہیں

کون دو دو تحیرات سہے
مجھ کو دیکھو تو مسکراؤ نہیں

انصر منیر

پھر آنکھ میں لایا تھا کوئی خواب ہمارے
جب سوکھ گئے ہجر میں تالاب ہمارے

آنا ہے ابھی یارِ منافق کا علاقہ
اوپر سے ہیں فقدان میں اسباب ہمارے

لگتا ہے محبت میں ہمیں مات ہی ہو گی
خوش باش جو پھرتے ہیں وہ بیتاب ہمارے

فرہاد کو ہم نے ہی محبت پہ لگایا
یہ قیس وغیرہ بھی تھے القاب ہمارے

بہتر ہے کہ ہم عشق کے بارے میں ہی سوچیں
ویسے بھی تعاقب میں ہیں گرداب ہمارے

اک دید نے آنکھوں کو کئی ضبط سکھائے
تھمنے تھے کہاں یار یہ سیلاب ہمارے

یہ رنج بھی انصر ہے مصیبت میں زیادہ
گھٹتے ہی چلے جاتے ہیں احباب ہمارے

غزل

کر نہ پائے اہلِ رخصت برابری اپنی
کیوں کہ قتل گہ میں تھی روز حاضری اپنی

آ رہی ہے اُن سے اطلاع سرخ دھوئیں کی
چھوڑ آئے تھے جو فصلیں ہری بھری اپنی

آستیں الٹنے تک پُرتپاکیاں روکو
کیونکہ مل رہی ہے جاجا برادری اپنی

ایک کانچ پھر ٹوٹا ہے مری ہتھیلی پر
سوجھنے لگی ہے سب کو نمک گری اپنی

ہم کو ناز ہیاپنے ضبط کی بلندی پر
اور زور سے لا ہم تک زور آوری اپنی

میں اسے جدائی کا طیش دے کے دیکھوں گا
یہ حسِ محبت ہے کس قدر جری اپنی

بے عباؤں کی جانب رخ نہیں کیا ساگر
ہم سمیٹ لائے تو بس بیچادری اپنی

ساگر حضور پوری

غزل

زبیر خیالی

جب سے اِملاک کے اسباب کنارہ کش ہیں
میرے اطراف سے مہتاب کنارہ کش ہیں

میری تعبیر کی تکمیل نہیں ہو پائی
میری آنکھوں کے سبھی خواب کنارہ کش ہیں

دلِ خوددار بغاوت پہ اتر آیا ہے
بے ضروری ادب آداب کنارہ کش ہیں

مہر و اخلاص و مروت کا ہے نقدان یہاں
آدمی گوہرِ نایاب کنارہ کش ہیں

خشک آنکھوں کا ہے رونا بڑا اعصاب شکن
شدتِ اشک کے سیلاب کنارہ کش ہیں

اب غمِ نو کی تلافی نہیں تسلیم انھیں
اِس لئے تیرے شفایاب کنارہ کش ہیں

مجھ سے تعظیمِ خرافات خیالی نہ ہوئی
میری اِس بات پہ احباب کنارہ کش ہیں

غزل

ناؤ واپس جاتی ہے اور سوچ رہا ہے جاٹ
ساون کے موسم میں اب کے اترا ہے کس گھاٹ

جوگی بانی، من میں اتری، اکتارے کی تال
پھول کی پتی کی نرمی ہے یا ہیرے کی کاٹ

ہر ٹکڑ بھٹیارن روکے، لقمہ لقمہ چکھ لے
آخر اک دن لگ جائے گی اس دنیا کی چاٹ

اپنے بھاگ کا بوجھ اٹھائے گیہوں کو گھن کھائے
اوپر نیچے گھوم رہے ہیں چکی کے دو پاٹ

بدری میں چندا شرمائے، رین اکیلی ناچے
اندھیارے میں کون اڑائے بوتل پر سے ڈاٹ

سورج آنکھ ملے تو پنچھی بھور کا راگ الاپے
من موجی دیوانہ کا ہے چھوڑے اپنی کھاٹ

عابد رضا

غزل

اپنے حصے کے ستارے بانٹ دوں
روشنی کے استعارے بانٹ دوں

بس یہ خواہش ہے تمھارے پیار میں
ڈوب کر تنکے سہارے بانٹ دوں

آخری حل ہے بقا کی جنگ میں
غیرتوں کے کچھ شمارے بانٹ دوں

کتنا مشکل تھا جدائی کے سبب
پیار کو پاؤں یا پیارے بانٹ دوں

مجھکو کانٹوں سے ہے رغبت اس لیے
پھول جتنے ہیں میں سارے بانٹ دوں

سائیہ دیوار کیا دیوار بھی اپنی نہیں
اور ہے خواہش سہارے بانٹ دوں

فرح شاہد

غزل

تا مرگ اشکِ غم ہی کے سامان ہو گئے
دیکھا تو نوحہ خوان بھی حیران ہو گئے

وحشت نے صرف آبلے ہی تو نہیں دیئے
ہم خود بھی کیسے چاک گریبان ہو گئے

پہلے تو دشت ہی میں تھیں ویرانیاں ، مگر
پھر یوں ہوا کہ شہر بھی ویران ہو گئے

اب انتظار جاناں کا مجھ کو نہیں رہا
مجھ پر اَجَل کے مرحلے آسان ہو گئے

لکھتے رہے ہم اس کی جدائی کی داستاں
صد شکر، یوں ہی صاحبِ دیوان ہو گئے

اب وصل کیا، کہ نعمتِ ہجراں بھی چھن گئی
نازش ، ہم آج بے سر و سامان ہو گئے

حسنین نازش

غزلیں

وقت کا ایک سال بیت گیا
ہجر تھا یا وصال بیت گیا

کہیں مال و منال ڈوب گئے
کہیں حسن و جمال بیت گیا

کہیں قسمت رہی اندھیروں میں
کیں اوجِ کمال بیت گیا

جیسے خوابوں کا سلسلہ کوئی
بن کے رنگیں خیال بیت گیا

کوئی دن رات ہمرکاب رہا
کوئی بن کر سوال بیت گیا

خواہشوں کے سراب رستوں پر
ایک شہرِ غزال بیت گیا

کتنے ساتھی بچھڑ گئے جاوید
لوگ کہتے ہیں سال بیت گیا

جاوید عباس جاوید

کسی کی کون سنتا ہے کہانی
ہوئے ہیں سب اسیرِ بے زبانی

نہیں ملتا کوئی غمخوار ، ہمدم
عجب اک ہو گئی نقلِ مکانی

زمینوں پر نہیں ہے رزق باقی
پرندے اُڑ گئے سب آسمانی

وفائے دوستاں جانے کہاں ہے
دلوں میں بڑھ گئی ہے بدگمانی

کہاں اب رات بھر کی داستانیں
ہوا ویران شہرِ قصہ خوانی

کبھی جو محفلوں کی جانِ جاں تھے
اُنہیں کہنا پڑا ہے آں جہانی

ہوا جاوید آشوبِ زمانہ
غزل میں آ گئی ہے نوحہ خوانی

غزلیں

رنگوں کا امکاں نظر میں رہتا ہے
چہرہ اک انجان نظر میں رہتا ہے

آنکھ سے آنکھ کہانی چلتی رہتی ہے
روز و شب کا دھیان نظر میں رہتا ہے

عزم و یقیں سے منزل حاصل کر لوں گا
راستوں کا امکان نظر میں رہتا ہے

آئینے سے آنکھ ملا کر گزروں تُو
عکس کوئی حیران نظر میں رہتا ہے

اُس کی یاد ہے سایہ بن کر ساتھ مرے
وہ ہے میری جان نظر میں رہتا ہے

جا کر اُس کی چُھو آؤں میں آنکھوں سے
حل یہی آسان نظر میں رہتا ہے

علی بن عزیز

ہجرتوں کا ملال ہے باقی
دریوں کا خیال ہے باقی

ہر طرف اِک نظر بھٹکتی ہے
ہر طرف اک سوال ہے باقی

ختم ہونے پہ کیوں نہیں آیا
کیوں پرندوں کا جال ہے باقی

جس سے بازی الٹ ہی جانی ہے
ایک ایسی بھی چال ہے باقی

سانپ کوئی نہ اُس پہ آ جائے
وہ جو پھولوں کی ڈال ہے باقی

تم ابھی سے ہو بے قرار مگر
اُس سے ملنے کو سال ہے باقی

غزل

برف کی سل میں آگ کی حدت بننے تک
صدیاں بیتیں ہجر کو قربت بننے تک

تم کیا جانو کیا کیا گزری ہے دل پر
اکلوتی خواہش کے حسرت بننے تک

کتنے جذبوں کو جاں دینا پڑتی ہے
شکوے اور گلے کے مدحت بننے تک

خوں سے لکھی جاتی ہے تاریخِ عالم
اقلیت سے قوم کو کثرت بننے تک

کوئی پوچھے میرے زخم سے بھی نعمان!
کیا گزری آزار پہ لذت بننے تک

نعمان محمود

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اہل زنداں کے لیے تازہ ہوا آنے کو ہے
شہر جاناں سے کوئی تازہ ہوا آنے کو ہے

غزل

ہوا بن کر زمین و آسماں میں پھیل جاتا ہے
دھواں اٹھتا ہے تو سارے جہاں میں پھیل جاتا ہے

کسی کے بغض کا اظہار کوئی بے ضرر سا لفظ
لہو کے ساتھ مل کر جسم و جاں میں پھیل جاتا ہے

کہانی کار اکثر چھیڑ دیتا ہے کوئی موضوع
تنازع حلقۂ دیدہ وراں میں پھیل جاتا ہے

قلم لکھتا ہے تصویریں ہوا کے صاف پردے پر
محلے کا ڈرامہ داستاں میں پھیل جاتا ہے

بدل جاتی ہے گردش میں ستاروں کی ہر اک ترتیب
اور آئندہ کا خوف آشفتگاں میں پھیل جاتا ہے

لئے پھرتے ہیں اپنے دوش پر ہم بے گھری کا کرب
یہ ایسا درد ہے کون و مکاں میں پھیل جاتا ہے

شکستہ آئنے کا عکس افسردہ نگاہی سے
نکل کر آستیں سے آستاں میں پھیل جاتا ہے

اورنگزیب حسام حر

غزل

تم سمجھتے ہو کہ، اشکوں میں بھلایا ہوگا
دل تو کیا چیز ہے، وہ جاں میں سمایا ہوگا

میری آنکھوں نے بھی، پتھر کا ہنر سیکھ لیا
ایک مدت ہوئی، جب اشک بہایا ہوگا

دیکھ زخموں کو، کئے بیٹھا ہوں تازہ پھر سے
مجھ کو پھر غیر نے، کچھ یاد دلایا ہوگا

اک نشہ رہتا ہے اک عمر ہوئی ہے مجھ پر
اس نے ہاتھوں سے کبھی، آب پلایا ہوگا

حالت حال مری، بن کے جو خاموش رہا
اس نے دل کی جگہ، پتھر ہی سجایا ہوگا

شہر بھر میں جو یہ نفرت کی زباں عام ہوئی
شعبدہ گر کوئی، مسند پہ بٹھایا ہوگا

اک ہنسی ہونٹوں پہ، بے درد کے آئی ہوگی
خاک کو خاک میں، جب اس نے ملایا ہوگا

عامر مُعان

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

پریشاں رو ، کسی پہلو نہیں تھا
ترا غم موجۂ خوشبو نہیں تھا

غزل

ہر گام پر ہے جی کا زیاں احتیاط سے
ہے رہ گزار عشق یہاں احتیاط سے

ٹوٹے کہیں نہ دل کا مکاں احتیاط سے
رکھے ہیں اس میں خواب نہاں احتیاط

دل آبگینہ ٹوٹا تو جڑنے کا پھر نہیں
نازک معاملہ ہے میاں احتیاط سے

وہ جائے احترام پہ فائز ہو سدا
جس شخص نے بھی کھولی زباں احتیاط سے

ایسا نہ ہو کہ مہر کے بادل کو لے نگل
ہر سو ہے نفرتوں کا دھواں احتیاط سے

عہد شباب میں جو رہے شتر بے مہار
پیری میں اب ہے ان کا بیاں احتیاط سے

یہ شہر منکرینِ وفا کا ہے اے نوید
دینا یہاں وفا کی اذاں احتیاط سے

نوید عاجز

غزل

حرف کو حرف سے سنوارتے ہیں
یوں سخن کو بھی ہم نکھارتے ہیں

روز لکھتے ہیں تجھ پہ تازہ غزل
تجھ کو یوں دل میں ہم اتارتے ہیں

بس وہ لمحے نہیں بھلاتے ہم
جو تیرے ساتھ ہم گزارتے ہیں

ان گنت خط جو تیرے نام لکھے
ان کو چپکے سے ہم شمارتے ہیں

روز کرتے ہیں خود سے بات تیری
اور پھر اپنا آپ ہارتے ہیں

خال و خد تیرے بننے لگتے ہیں
نقش کاغذ پہ جب ابھارتے ہیں

اس کی آواز آنے لگتی ہے
جب بھی ثقلین ہم پکارتے ہیں

ثقلین جعفری

غزل

راستی پہچان ہونی چاہیے
صورتِ ایمان ہونی چاہیے

صبحِ نو تخلیق کرنے کے لئے
مشعلِ عرفان ہونی چاہیے

پارسا ہونے سے پہلے سوچ لے
خصلتِ اِنسان ہونی چاہیے

تُم ہٹا دو گے پہاڑوں کو مگر
قوتِ ایمان ہونی چاہیے

وقت آئے گر کبھی اِس دیس پر
جان یہ قربان ہونی چاہیے

سوچ میں رکھنا ہمیشہ رفعتیں
زندگی ذی شان ہونی چاہیے

گفتگو جاوید بنتی ہے حسیں
نظم خُوش اِلحان ہونی چاہیے

جاوید ڈینی ایل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دل دھڑکنے پہ بھی آمادہ نہ پایا خالد
ہر نفس گوش بر آواز خدا اپنا تھا

غزل

شاعری باعثِ تضحیک نہیں ہوتی ہے
’رزق ہوتی ہے میاں! بھیک نہیں ہوتی ہے‘

حُسن والوں سے ملا دل کے طبیبوں سے ملا
آہ بیماریِ دل ٹھیک نہیں ہوتی ہے

کاٹے کٹتا نہیں دن ہجر کا اندھیر یہ ہے
رات کٹ جائے تو تاریک نہیں ہوتی ہے

دل سے سچ مانیے جُھٹلائیے باقی سب کو
عشق کے دھرم میں تشکیک نہیں ہوتی ہے

جانے کیوں اُن کی سمجھ میں نہیں آتی دل کی
بات عارض کی تو باریک نہیں ہوتی ہے

سرفراز عارض

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پھوٹیں ہوا کی شاخ پہ لہروں کی پتیاں
کھلنے کو پھر کوئی گلِ گرداب اور ہے

غزلیں

اچانک آئے مجھے جو نظر در و دیوار
تھے وقفِ لذّتِ رنگِ سحر در و دیوار

نگاہ فیض ہے کس کی مجھے بتائے کوئی
بنے ہوئے ہیں یہاں بال و پر در و دیوار

جھکا ہوا جو ایوانِ کائنات یہاں
نجانے کیسے تھے وہ پیشتر در و دیوار

گریباں پھاڑے نہ پھر کیوں فلک پہ کاہکشاں
اگر ہو جائیں وہ میرے ہی راہبر در و دیوار

خدا کی شان نصیبوں نے یوں چمکنا تھا
بہلتے جاتے ہیں وہ دیکھ کر در و دیوار

بنایا گھر جو ہے اس نے مرے مکاں کے قریب
''ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار''

فرشتے آئیں قدم چومنے کو اے انور
قدم قدم پہ قدم لیں اگر در و دیوار

بہتا رہے گا آنکھ میں ساگر کہے بغیر
آباد ہو گا یونہی مرا گھر کہے بغیر

لکھتا رہوں گا بہرِ تسلّی کوئی غزل
کیا آؤں روز و شب ترے در پر کہے بغیر

پھولوں سے جب یہ پوچھا تو خاموش ہو گئے
کس نے بچھایا خار کا بستر کہے بغیر؟

دل ہی میں ڈھونڈا اب جو گزرتی ہے ان دنوں
کیوں ڈھونڈتا ہے ان کو ''ستمگر'' کہے بغیر

بخشش ہے یہ بڑھاپے کی دل میں نہ لا ملال
''سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر''

آگے خیال اس کا ہے ناصح! ترے نصیب
کہنا یہی تھا کہہ دیا گھر پر کہے بغیر

کتنا اثر ہے گفتگوئے حق کا اے کبیر
چرچا ہے اب بھی آپ کا گھر گھر کہے بغیر

کبیر انور جعفری

غزل

سرحد کی امانت میں خیانت نہیں کرتے
ہم اپنے ہی لشکر سے بغاوت نہیں کرتے

سرسبز بہت سالوں سے رکھا ہے اسی نے
ہم یونہی ترے غم کی کفالت نہیں کرتے

یہ سانس ہی سرمایہ ہیں، دُنیا میں تمہارا
سو ضائع کبھی ذکر کی ساعت نہیں کرتے

یہ اپنی متاع مانتے ہیں خالقِ کُل کو
احوال پہ دیوانوں کے حیرت نہیں کرتے

کچھ مصرعے بہت خاص عطا ہوتے ہیں جامی
کم فہم، کبھی اتنی ریاضت نہیں کرتے

مستحسن جامی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

قریب جاؤں تو سو رنگ میں بکھر جائے
گلے لگاؤں، تو کیسے گلے لگاؤں اُسے

غزل

زیست ناسور ہے
دل جو مہجور ہے

دل ہی کیا جسم بھی
زخموں سے چور ہے

عشق میں موت بھی
ہم کو منظور ہے

جس کو زیبا نہیں
کیوں وہ مغرور ہے

حُسن کے سحر سے
عشق مسحور ہے

خامشی ! سُن ذرا
چیخ محصور ہے

آج کیا بات ہے
شام مخمور ہے

چاند روٹھا ہوا ہے
رات بے نور ہے

دل تری یاد سے
اب بھی معمور ہے

اک دیا کیا کرے
رات بھرپور ہے

سب کو کرکے عیاں
خود وہ مستور ہے

آج کل دل مرا
یوں ہی رنجور ہے

غم زدہ ہیں سبھی
ون مسرور ہے

بے کسوں کے لیے
چُپ کا منشور ہے

کچھ بھی تابش نہیں
یوں ہی مشہور ہے

محمد آفتاب تابش

غزلیں

میری کُٹیا میں کب روشنی
گھر میں تیرے ہے سب روشنی

کب تلک تیرہ شب میں رہیں
بھیج دے میرے رب روشنی

آنکھ جب سے پرائی ہوئی
چِھن گئی میری سب روشنی

جب اندھیرے میں ٹھوکر لگی
یاد آئی ہے تب روشنی

چاند تاروں کا در نہ کھلا
میں نے مانگی تھی جب روشنی

جب ضرورت تھی آئی نہیں
کس لئے آئی اب روشنی

وہ جو افضل ہوئے جلوہ گر
بن گئی میری شب، روشنی

افضل ہزاروی

کتنی حسین شام ہے کچھ تو خیال کر
ایسے میں تجھ کو کام ہے کچھ تو خیال کر

ساقی بتا کہ ہم سے تری دشمنی ہے کیا؟
خالی ہمارا جام ہے کچھ تو خیال کر

اپنوں پہ چل رہی ہیں تری حکمرانیاں
غیروں کا تُو غلام ہے کچھ تو خیال کر

جو آیا منہ میں کہہ دیا اتنا تو سوچ لے
کس سے تُو ہم کلام ہے کچھ تو خیال کر

دیتی نہیں ہیں زیب تجھے چاپلوسیاں
اونچا ترا مقام ہے کچھ تو خیال کر

سر ہے نہ اِس کا پیر ہے نا کوئی بحر ہے
کیسا ترا کلام ہے کچھ تو خیال کر

افضل سے ہے زبانی، بغل گیر غیر سے
کیسا ترا سلام ہے کچھ تو خیال کر

غزل

مِل نہیں سکا اب تک سچ کسی کے بارے میں
کس قدر کتابیں ہیں آدمی کے بارے میں

مُنحرف سے رائے لو، دشمنی کے بارے میں
دوستوں سے مت پوچھو دوستی کے بارے میں

بے یقین ہیں خود میں موت کے تمنائی
زہر جب اگلتے ہیں زندگی کے بارے میں

دو غزال آنکھوں کی یاد آ چھلکتی ہے
بات جب نکلتی ہے مے کشی کے بارے میں

ہم نے سادھ لی جو چُپ پھر سُنی گئی ہر سو
سو طرح کی باتیں ہیں خامشی کے بارے میں

خوف ہو روایت کا پھر بھی خواب پلتے ہیں
آنکھ بول دیتی ہے عاشقی کے بارے میں

مٹ کبھی نہیں پائی مفلسی ہماری بھی
شاعری بہت لکھی مفلسی کے بارے میں

ردا حاصل خلوص

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اندھیر رہ نہیں سکتا سدا خدائی میں
خدا گواہ بنے گا مری صفائی میں

غزل

جب بات خواہشات سے آگے کی بات ہے
ظاہر ہے میری بات سے آگے کی بات ہے

آنکھوں نے دل پہ ساری حقیقت کو لکھ دیا
اور یہ قلم دوات سے آگے کی بات ہے

روحِ فرات قید ہوئی ایک مشک میں
موسیٰؑ کے معجزات سے آگے کی بات ہے

ایسا ردھم بنائیں گے اس کے لبوں سے لفظ
فعلن مفاعلات سے آگے کی بات ہے

تیمور مجھ سے موت کے قاصد نے یہ کہا
راحت غمِ حیات سے آگے کی بات ہے

سیّد تیمور کاظمی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد نمازِ مدح ادا ہو تو کس طرح
کس نم مہک سے تیرے ثنا گر وضو کریں

غزلیں

چُپ کے مارے ہوئے جب سوئے غزل جاتے ہیں
اپنے ہی لفظوں کی وحشت سے دہل جاتے ہیں

میں نے ہجرت کی اذیت سے یہی سیکھا ہے
فاصلے گہرے تعلق بھی نگل جاتے ہیں

گرمیٔ حیرتِ رفتارِ زمانہ توبہ
خواب آنکھوں میں اترتے ہیں پگھل جاتے ہیں

رنجِ ناکامی بھی ٹل جائے گا آخر ایک دن
حادثے موت کے ذہنوں سے نکل جاتے ہیں

باغباں کیسی گزرتی ہے ترے دل پہ بتا
لوگ جب جاتے ہوئے پھول مسل جاتے ہیں

پاسِ ناموسِ انا رکھے تو کیا دیکھتا ہے
تیرے درویش کے ہاتھوں سے عمل جاتے ہیں

ارتقاء ہوتا ہے ذہنوں کی زمینوں پر آصف
طعنہ گو لاکھ کہیں لوگ بدل جاتے ہیں

آصف محمود

اب ہم کو عطا کر کہ بھلے ٹال ہماری
عرضی ہے ترے آگے ہی لجپال ہماری

پہلے تو اسے پاسِ تعلق بھی نہیں تھا
اب ڈھونڈتا پھرتا ہے جو تمثال ہماری

مونہوں میں پڑے پھولتے رہتے ہیں نوالے
جل جاتی ہے چولہے پہ دھری دال ہماری

یہ کہہ کے براہیم نے پورا نہ کیا کام
کر لیں میں اسے دیکھ لے گی آل ہماری

اے دیکھنے والے تو ہمیں دیکھ رہا تھا
چوراہوں پہ جب کھینچی گئی کھال ہماری

پہچان لیے جاتے ہیں اندھیرے میں ہم لوگ
چلتے ہیں ہمیں صرف یہاں چال ہماری

اک شعر حوالہ تھے نئے دیس میں اپنا
اور دوسری پہچان بنے بال ، ہماری

غزل

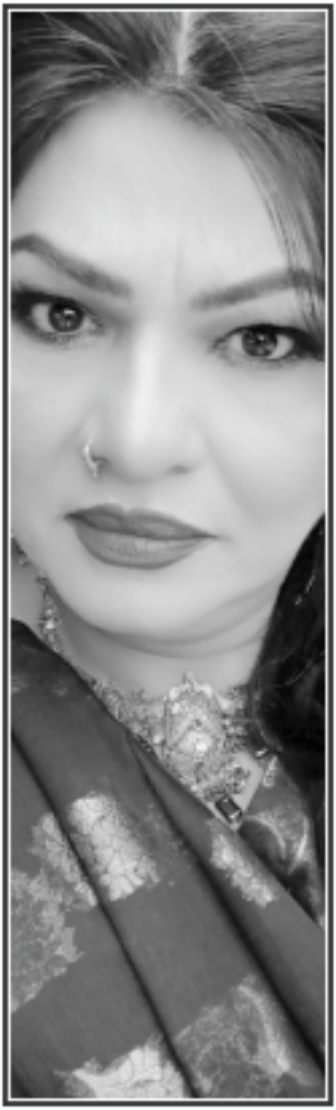

مجھے بتا تو سہی کیسا خوف لاحق ہے
وہ خود ڈرے ہوئے ہیں جن کا خوف لاحق ہے

سیاہ رات کے اس پار کیسے جاؤ گے
جو دن کے وقت تمہیں اتنا خوف لاحق ہے

مجھے تو کچے گھڑے پر بھی تیرنا آئے
وہ اور ہیں جنہیں دریا کا خوف لاحق ہے

ازل سے پیار کو میں جرم سنتی آئی ہوں
یہ آخری نہیں ہے پہلا خوف لاحق ہے

قدم قدم پہ وہ مڑ مڑ کے دیکھتا رہا ہے
مگر مجھے نہ بتا پایا، خوف لاحق ہے

جو کسرِ شان سمجھتا ہے ڈرنا دنیا سے
اس ایک شخص کا ہر لمحہ خوف لاحق ہے

گرجنا دھاڑنا میں چھوڑ دوں جیا لیکن
مرا قبیلہ یہ سمجھے گا خوف لاحق ہے

جیا قریشی

غزل

خواہشوں کی مسافت اَکارت نہ کر
عمر بھر کی ریاضت اَکارت نہ کر

پھر کسی دن پہ شکوے اُٹھا رکھ، ابھی
وصل کی تُو لطافت اَکارت نہ کر

بے وفائی کی بدعت سے آنسو نہ پونچھ
عشق جیسی عبادت اَکارت نہ کر

زندگی کے سبھی رمز اِس میں چھپے
درد و غم کی یہ دولت اَکارت نہ کر

عشق توفیق ہے جو تجھے مل گئی
یہ خدا کی ودیعت اَکارت نہ کر

یہ ملاقات مہدی غنیمت سمجھ
تُو گھڑی بھر کی ساعت اَکارت نہ کر

غضنفر مہدی

غزل

رونقیں دار کی بڑھاتے ہوئے
میں مرا عہد کو نبھانے ہوئے

روشنی زخم کی کچھ اور بڑھی
شہر کو راستہ دکھاتے ہوئے

میرے اندر کا شور بڑھتا گیا
چپ کی دیوار کو اٹھاتے ہوئے

خود کلامی کی پڑ گئی عادت
وسوسوں کی چتا جلاتے ہوئے

ہجر کی تلخیاں کہ بڑھتی گئی
فاصلوں کا گلہ دباتے ہوئے

کیسے کیسے جتن کیے میں نے
تیرے پہلو میں گھر بناتے ہوئے

جانے کس کرب سے میں گزروں گا
میرے امجد تجھے بھلاتے ہوئے

امجد خان تجوانہ

غزل

ہمیشہ مستعد رہنا کہ غفلت مار دیتی ہے
کٹھن حالات میں انساں کو راحت مار دیتی ہے

اے میرے بدگماں! تجھ کو خبر کیا اس حقیقت کی
وفاؤں کے تماشے کی اذیت مار دیتی ہے

ریاکاری میں شہرت کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا
دکھاوے کی ہو نیت تو عبادت مار دیتی ہے

عقیدت میں گرے تھے جو خودی سے ہاتھ دھو بیٹھے
یہاں اُلفت کے دھوکے میں عقیدت مار دیتی ہے

تعلق کو نبھانا ہو تو پھر شکوہ نہیں کرتے
محبت میں سنا ہے یہ، شکایت مار دیتی ہے

شکستہ شوقِ تکمیلِ تمنا رہ گئی میری
یہاں معصوم خوابوں کو حقیقت مار دیتی ہے

سنو تم لوحِ دل پر قیس کا مصرع یہ لکھ رکھو
محبت سے رہو عاری محبت مار دیتی ہے

گلے کا طوق بنتی جا رہی ہیں تلخ یادیں سب
منافق سے عقیدت کی ندامت مار دیتی ہے

وہاں پر زین چڑھ جاتا ہے خود انصاف سولی پر
جہاں کم ظرف قاضی کی خیانت مار دیتی ہے

عبدالرؤف زین

غزلیں

کیوں تری بے سبب ضرورت ہے
یہ سمجھنے کی اب ضرورت ہے

صاحبا! بیلیا! بتا تجھ کو
میرے جیسوں کی کب ضرورت ہے؟

پیسہ ، گاڑی ، مکان اور شہرت
یار تیری عجب ضرورت ہے

آج تک انتظار ہے مجھ کو
تو کہے ایک شب ''ضرورت ہے!''

تیرے رستے نے سب دکھایا ہے!
مان تیری یہ سب ضرورت ہے!

کس طرح سے کہوں مجھے اس کی
اے خدا! بے سبب ضرورت ہے!

مجھ کو پہلے تری نہیں تھی پر
ہنزلہ مجھ کو اب ضرورت ہے

خواب کے اجڑنے میں دیر کتنی لگتی ہے
جسم کے بکھرنے میں ، دیر کتنی لگتی ہے

دیکھ میرے دانشور میں نہیں بتاؤں گا
زاویے بدلنے میں ، دیر کتنی لگتی ہے

اب اگر ملے گا تو میں یہ اس سے پوچھوں گا
اس طرح سنبھلنے میں ، دیر کتنی لگتی ہے

ہجر ہے نیا میرا سو مجھے یہ بتلاؤ
یاد سے سلگنے میں ، دیر کتنی لگتی ہے

وحشتوں کے ماروں کو ہم سے بے سہاروں کو
دشت سے نکلنے میں دیر کتنی لگتی ہے

اک گلی سے یاروں کو تیرے رازداروں کو
سر جھکا کے چلنے میں دیر تنکی لگتی ہے

کس طرح سے دنیا کو میں بتاؤں فرحت جی
آپ جیسا بننے میں دیر کتنی لگتی ہے

ہنزلہ شاہد

غزلیں

جان لیوا ہو بھی تو یلغار دیکھی جائے گی
آ گئے میدان میں تو یار دیکھی جائے گی

لو کھڑے ہیں ترکشِ مژگاں کے آگے آج ہم
اب یہ دل کے آر ہو یا پار دیکھی جائے گی

پانیوں میں بحر و بر سے ہو گئی ہے دوستی
اب کریں یا نا کریں ہم پار دیکھی جائے گی

وہ خفا تو ہیں مگر اس دل حزیں کے واسطے
جا رہے ہیں پھر بھی کوئے یار دیکھی جائے گی

ہم نے لفظوں سے بنائی ان نگاہوں کی شبیہ
یہ ہے وہ تصویر جو ہر بار دیکھی جائے گی

ہم نے سر جو رکھ دیا ہے یار کی چوکھٹ پہ پھر
اس طرف ہے پھول یا تلوار دیکھی جائے گی

کیا بگاڑے گی ہمارے حوصلوں کا زندگی
ہم لڑے ہیں چرخ سے ہر بار دیکھی جائے گی

زندگی ہوتی ہے تو ہو جائے ابتر پر ادیب
چھوڑنا مت دامنِ دل دار دیکھی جائے گی

محمد علی

بڑی قسمت ہے پیار ہو جانا
جان و دل کا نثار ہو جانا

یار کے نام کے وظیفے سے
روح و دل کا سنگھار ہو جانا

جس جگہ یار کے قدم آئیں
اُس جگہ کی غبار ہو جانا

دل جلا کے جو روشنی پاؤ
عشق میں تار تار ہو جانا

یہ محبت ہے دید پاتے ہی
دل کا بے اختیار ہو جانا

تُم ہو رازِ وفا و مہر ادیب
نہ کبھی آشکار ہو جانا

غزلیں

ہے لفظ کے باطن میں بھی افسون ہمارا
آسانی سے کھُلتا نہیں مضمون ہمارا

ہم دشتِ محبت میں ہیں اُستاد سبھی کے
کیا کھیل بگاڑے کوئی مجنون ہمارا

اس شہر سے ہم کوئی تعلق نہیں رکھتے
جس شہر میں چلتا نہیں قانون ہمارا

کہتا ہے ہر اک سے کہ ہمی اس کے خدا ہیں
رہتا ہے ہمیشہ کوئی ممنون ہمارا

اے اشکِ عزا آ کے ہمیں آگ لگا دے
اے شعلۂ فرقت تو جگر بھون ہمارا

وہ ہاتھ کبھی اپنے مقدر میں نہیں تھا
جس ہاتھ پہ چمکا نہیں زرقون ہمارا

گُل رنگ اُٹھاتے ہیں فقط اس کی نمو سے
اس خاک پہ گرتا ہے جہاں خون ہمارا

ہم ساتھ لیے پھرتے ہیں اس نعش کو آرب
اک خواب ہے اس آنکھ میں مدفون ہمارا

آرب ہاشمی

اس کے لب پر ہے فسوں دل میں ریاکاری ہے
یہ محبت تو محبت کی اداکاری ہے

عین ممکن ہے چراغوں سے مدد لی جائے
آج کی رات ستاروں پہ بہت بھاری ہے

یہ مری آنکھ کا دروازہ ہے خستہ کتنا
یہ مرے خواب کی ٹوٹی ہوئی الماری ہے

جس طرح دشت میں ہو ٹھنڈی ہوا کا جھونکا
تجھ سے ملنے پہ عجب روح میں سرشاری ہے

میں نے جب اس کو بتایا کہ فراق آئے گا
تو میرے دل نے کہا آپ کی تیاری ہے؟

اس کی باتوں کی مہک زندہ ہے دل میں آرب
اس کے لہجے کا فسوں آج تلک طاری ہے

مسلسل غزلیں

فرشتوں کو کوئی دھوکا ہوا تھا
میں جنت سے اکیلا چل پڑا تھا

اندھیری رات تھی اور چار سو چپ
میں اپنے آپ سے الجھا ہوا تھا

کوئی اے کاش مجھ سے پوچھ لیتا
میں کیوں اتنا ڈرا سہما کھڑا تھا

کوئی کچھ کہہ رہا تھا اور کوئی کچھ
عجب اک معرکہ برپا ہوا تھا

نوید اک رنج ہوتا تو بتاتا
درونِ دل کوئی میلا لگا تھا

.....☆.....

سفر تو جیسے تیسے کٹ گیا تھا
سفر کے بعد الجھن میں پڑا تھا

کسی بے فیض ساعت کا اثاثہ
یہاں بھی خیر سے میرا ہوا تھا

مجھے میرے اکیلے پن کی خبریں
مسلسل کوئی تو پہنچا رہا تھا

کہیں نبضیں، کہیں سانسیں رُکی تھیں
میں اپنے آپ سے کچھ کہہ رہا تھا

کئی کردار میرے ہم نوا تھے
کہانی کار مشکل میں پڑا تھا

عجب کیا تھا میں خود کو مار دیتا
کوئی وعدہ مجھے روکے ہوا تھا

نوید اب سوچتا ہوں اس گلی میں
میں آخر کس لیے ٹھہرا ہوا تھا

.....☆.....

سراپا خوشبوؤں کا آئنہ تھا
میں جھلمل جنگلوں میں گھومتا تھا

کبھی میں لہلہاتی کھیتیوں میں
ہری پگ ڈنڈیوں پہ گھومتا تھا

مجھے ماحول نے اندھا کیا ہے
میں سبزی مائل آنکھیں دیکھتا تھا

یہ میں لاہور میں جو آ بسا ہوں
مرا شہر اس سے کوئی کم برا تھا

یہی نغمے، یہی جلوے وہاں تھے
بہاول پور مجھ کو آئنہ تھا

کوئی جادو جگاتی گمرہی تھی
کہیں پانی کا جھرنا بہہ رہا تھا

سجی سنوری فضاؤں سے الجھ کر
نجانے میں اِدھر کیوں آ گیا تھا

کوئی چہرہ ، کوئی خوش رنگ چہرہ
مری آنکھوں میں بستا جا رہا تھا

مرے بارے میں کم کم سوچتے تھے
میں ایسے دوستوں میں گھر گیا تھا

مجھے خود سے عداوت ہو رہی تھی
مرا ہونا نہ ہونا مسئلہ تھا

کوئی جھگڑا نہیں تھا مال و زر پر
مگر دیوار پر جھگڑا ہوا تھا

.....☆.....

کوئی آسیب تھا یا آئنہ تھا
میں خود سے دور ہوتا جا رہا تھا

دیا دیوار پر رکھا ہوا تھا
اندھیرا اور بڑھتا جا رہا تھا

گلی میں خوشبوئیں تھیں ، روشنی تھی
مرا ہونا کسی کو کھل رہا تھا

مجھے یاد آ رہا ہے، دھیرے دھیرے
اِنھی گلیوں میں کوئی کھو گیا تھا

سہولت تھی کہ زندہ پھر رہے ہیں
بہت دن موت کا چرچا رہا تھا

کہیں زہد و ریا کے وسوسے تھے
کہیں اخلاص کا چرچا بپا تھا

نوید! اب یاد آیا، اُن زمانوں
مجھے قصداً بھلایا جا رہا تھا

.....☆.....

میں اپنے آپ سے کٹنے لگا تھا
وہ میرے کان میں کچھ کہہ گیا تھا

یہی دنیا ، یہی بے رنگ دنیا
اِسی دنیا میں مَیں بھی کھو گیا تھا

عجب تھا میں کہ سنجیدہ بہت تھا
عجب تھا وہ کہ ہنستا جا رہا تھا

مجھے راس آ رہی تھیں وہ فضائیں
میں کس ماحول کا مارا ہوا تھا

نوید اک آئنہ تھا ، بےبسی تھی
میں محفل میں اکیلا رہ گیا تھا

.....☆.....

کسی کج بحث سے ٹکرا گیا تھا
مَیں اپنے آپ سے الجھا ہوا تھا

جہاں اخلاق قدرِ اولیں تھا
میں اُس تہذیب کا پالا ہُوا تھا

سماعت میں کوئی خوشبو رچی تھی
لبوں پر آگہی کا ذائقہ تھا

مگر اِس وقت مجھ سے کون پوچھے
کہ مَیں بے ماجرا ، پُر ماجرا تھا

نوید اِک شام جو ٹھنڈی بہت تھی
گلِ اُمید کو کھلنا پڑا تھا

.....☆.....

مجھے ہنسنا ذرا مہنگا پڑا تھا
اُسے کچھ اور ہی دھوکا ہُوا تھا

گلِ ترتیب میرا منتظر تھا
زمانہ راستا روکے کھڑا تھا

یہ کوئی چل چلاؤ کی ہوا تھی
زیاں تھا اور منافع لگ رہا تھا

چراغوں کی لوؤں کا کپکپانا
مجھے اندر سے کھائے جا رہا تھا

یہ پس منظر سے منظر تک سفر بھی
مجھے بے ساکھیوں پر کاٹنا تھا

نویدِ صبح گاہی کے بہانے
مَیں ، خود منظر سے ہٹتا جا رہا تھا

.....☆.....

مناظر سے دھواں جو چھٹ رہا تھا
عناصر کو ہمارا سامنا تھا

وہی وعدہ کہ جس پر جی رہے تھے
کسی کی خامشی میں بہہ گیا تھا

عداوت در عداوت چل رہی تھی
مجھے اگلوں کا کرنا جھیلنا تھا

تمھیں کس نے بتایا میں غلط ہوں
تمھارا عندیہ کس پر کھلا تھا

کسی میں کچھ کسی میں کچھ کمی تھی
عجب لوگوں میں رہنا پڑ رہا تھا

نوید اک شام ، شام آخریں نے
مجھے رخصت کا سندیسہ دیا تھا

.....☆.....

یکا یک ایک ہنگامہ ہوا تھا
سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا تھا

میں خود سے دور ، اتنا دور رہ کر
خدا معلوم ، کیسے جی رہا تھا

سڑک پر لوگ دوڑے پھر رہے تھے
میں کھڑکی میں کھڑا سب دیکھتا تھا

عجب کیا ہے کہ میں خود سے بچھڑ کر
زمانے بھر میں سب کا ہو گیا تھا

وبالِ لمحۂ فرصت تھا مجھ کو
نوید اک شام جس کا آسرا تھا

نوید صادق

اُمید

سلمان جوں ہی گھر آیا تو رافیہ نے آڑے ہاتھوں لیا اور کہا۔

آج تو میں نے کچھ نہیں بنایا سب چیزیں ختم ہوگئی ہیں۔ سلمان نے بیچارگی سے کہا آج ساری تنخواہ ختم ہوگئی ہے۔

کیا آنکھیں پھاڑ کر پوچھا...اتنی جلدی۔

اس مرتبہ بجلی کا بل اتنا زیادہ آیا ہے کہ آج آخری دن تھا اگر نہ بھرتا تو صبح بجلی کٹ جاتی۔

میرے اللہ بچے صبح سے بھوکے ہیں.....اب کیا ہوگا.....رافیہ کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے وہ اپنے دالان میں کھڑے تھے ساتھ والے گھر میں آوازیں جا رہی تھیں.....

سلمان خود بھی بڑا پریشان تھا۔ پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا جیسے بہت بڑا سانحہ ہو گیا تھا۔

رافیہ نے غصے سے کہا اتنا پڑھ لکھ کر آفیسر تو بن گئے مگر گھر کا خرچ بھی پورا مہینہ نہیں چلتا کیا فائدہ اتنی محنت سے ڈگری پاس کرنے کا .....والدین بھی اس شہر میں نہیں ہیں کچھ مانگ تانگ کر ہی گزارہ کر لیتی آجا کے آپ کی بہن ہے اس کے بھی حالات ہم جیسے ہیں۔ فکر کیوں کرتی ہو ہمارا اللہ مالک ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی بندوبست کر دے گا۔

سلمان نے بیچارگی سے رافیہ کی جانب دیکھا وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ ہی رہا تھا کہ گھر کی کال بل بجی سلمان نے دروازہ کھولا تو ساتھ کے گھر کا پڑوسی ہاتھ میں ٹرے لیے کھڑا تھا سلمان نے اس کی جانب دیکھا اور خوش دلی سے کہا۔

رفیق تم۔

''جی میں''

تمھارے ایک لفظ نے اللہ مالک ہے تو مجھے مجبور کیا کہ بچے بھوکے ہیں کچھ ان کے لیے کرنا چاہیے۔ میری بیگم بریانی بنا رہی تھی میں نے اسے کہا۔

بلقیس ریاض

ڈبل بنانا....وہ حیران تھی۔

''کیوں''

''ساتھ والوں کے گھر آج چولہا نہیں جلا''۔

اس نے کچھ جواب نہیں دیا اور خاموشی سے بریانی بنا کر آدھی میرے حوالے کر دی۔

میں نے سوچا پڑوسیوں کا بڑا حق ہوتا ہے یہ اللہ کا فرمان ہے.....ہمارے گھروں میں صرف بیچ میں ایک دیوار ہی تو ہے۔

''مگر رفیق''

اگر مگر کی کچھ ضرورت نہیں ہے.....بچوں کو کھانا کھلاؤ.....پھر رات کو باتیں ہوں گی.....

تم میرے گھر آنا۔ سلمان نے حیرت بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا.....اور ٹرے اس کے ہاتھ سے لے کر شکریہ ادا کیا اور رفیق چلا گیا.....بچوں نے بریانی دیکھ کر ایک دم سے جھپٹ پڑے۔

رافیہ نے کہا۔

اپنی اپنی پلیٹیں لے کر آؤ.....پھر آرام سے کھانا۔

بریانی کھانے کے بعد.....سلمان بڑی ندامت محسوس کر رہا تھا کہ کس طرح اس مصیبت کے وقت وہ کھانا لے کر آ گیا تھا.....جب وہ ہیڈ کلرک سے آفیسر کی جاب میں آیا تو اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے.....جیسے کوہ ہمالیہ کی چوٹی اس نے سر کر لی ہو۔ مگر.....حالات ویسے ہی رہے مہنگائی کا گراف تیزی سے بڑھتا جا رہا تھا اور ہر چیز مہنگی ہونے کے ساتھ ساتھ بجلی کے بل بھی اتنے آنے لگے کہ وہ اپنی بے بسی پر دل ہی دل میں روتا رہا.....والدین نے اتنی محنت سے اسے پڑھایا لکھایا اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا تھا.....شادی ہوئی تو اس کے حالات کچھ بہتر تھے مگر بچوں کے بعد آہستہ آہستہ حالات نے کروٹ لی.....اور کنٹرول میں نہ رہے.....والدین بھی اگلی دنیا میں سدھار گئے۔ کہنے کو وہ ایک ایماندار آفیسر تھا.....مگر دن بدن حالات ناگفتہ ہوتے گئے مگر وہ کسی سے شکوہ نہیں کرتا تھا.....رافیہ اگر پڑھی لکھی نہ ہوتی تو بچوں کی فیسوں کے علاوہ ٹیوشن کے روپے ادا کرنے ان کے لیے مشکل تھے۔

رفیق کے حالات اور رہن سہن ان سے ہزار گناہ بہتر تھا.....دو بچے جو امریکن سکول میں پڑھ رہے تھے.....گھر میں ہر طرح کی آسودگی تھی.....سلمان نے اندازہ ہی نہ لگایا کہ وہ کیا کاروبار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے پورچ میں گاڑی تک کھڑی رہتی.....کبھی کبھار وہ بیوی بچوں کے ساتھ باہر جاتا ہوا دکھائی دیتا.....سلمان کو اس کی زندگی پر رشک آتا.....مگر اس نے رفیق سے کبھی نہیں کہا تھا کہ میں تم سے کم تر ہوں.....کیونکہ سلمان اچھی پوسٹ پر فائز

تھا....ایک روپیہ بھی رشوت کا نہیں لیتا تھا....شروع شروع میں اپنی زندگی میں بہت شاکر تھا مگر آہستہ آہستہ وہ پریشان رہنے لگا۔ گورنمنٹ سروس میں اتنی آمدنی نہیں ہوتی تھی کہ فیوچر کے لیے کچھ جمع کر لیتا والدین کی طرف سے اگر یہ گھر نہ ملتا تو اس کا کرایہ بھی وہ نہیں نکال سکتا تھا۔

آج....بریانی....رفیق لایا تو....وہ بہت ندامت محسوس کرتے ہوئے سوچ رہا تھا..... یہ دوست کتنا اچھا ہے کہ ہمارے حالات سے بڑا باخبر رہتا ہے....ایک مرتبہ بچوں کی فیس دینے کے لیے اسے رفیق سے ہاتھ پھلانے پڑے اور دو ماہ تک تھوڑے تھوڑے روپے لوٹائے....گو کہ وہ کہتا رہا کہ میں نے نہیں لینے مگر سلمان نے روپے کسی نہ کسی طرح لوٹا دیئے۔ مگر آج تو....وہ کھانا نہ لاتا تو بچے بھوکے ہی رہتے۔

وہ اپنے کمرے میں بیٹھا دفتر سے لایا ہوا کام کر رہا تھا....ویسے تو دفتر میں ہی کرتا تھا مگر آج بجلی کا بل دینے کی وجہ سے وہ کام گھر میں لے آیا تھا۔

ابھی کام ہی کر رہا تھا کہ رفیق کے سیل فون پر گھنٹی بجی۔

''ہیلو''

''سلمان میں رفیق''

''کہو''

''کیا کر رہے تھے''۔

دفتر سے کام لے کر آیا تھا وہ کر رہا تھا۔

''اچھا''

سلمان نے کہا۔

''کوئی کام ہے''

''ارے نہیں میں نے کہا تھا نا کہ رات کو تم آنا''۔

اوہ....میں بھول گیا....ایک گھنٹے کے بعد آؤں گا۔

''بچوں نے کچھ کھایا ہے''۔

وہ بریانی بچ گئی تھی نا وہ کھا کر سو گئے ہیں۔

اچھا جلدی آنا....میں منتظر رہوں گا۔ کچھ روپے ادھار دے دوں گا باقی کے دن آرام سے گزار لینا۔

''مگر''

اگر مگر نہیں جب ہوئے دے دینا....اور آنے کی سوچو تمہیں مشورہ دینا ہے۔

ٹھیک ہے ایک گھنٹے کے بعد پہنچ جاؤں گا۔

سلمان کام میں جت گیا۔

رات بڑی سنسان اور تاریک تھی بادل گھرے ہوئے تھے۔ ہوائیں تیز چل رہی تھیں۔ گرد و پیش ہر چیز ٹھنڈ سے ٹھٹھری ہوئی تھی....گلی کے مکان دھندلی دھندلی روشنی میں گرے ہوئے....صرف ایک ایک بلب جل رہا تھا....ساری فضا میں بدمزگی چھائی ہوئی تھی۔ ہوا تیز سے تیز تر درختوں

کے پتوں کو دور دور سے اڑا کے لیے جا رہی تھی.... کام کرتے کرتے.....سلمان کا دھیان رفیق کی باتوں سے الجھ جاتا....تم آؤ گے تو مشورہ کی بات ہو گی۔ نہ جانے کیا مشورہ دینا چاہتا ہے۔

ماضی کے واقعات ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں میں پھرنے لگے۔ خیالوں کی دھوپ چھاؤں میں رافیہ کا چہرہ سامنے آ گیا....جہاں دنیا بھر کے ارمان مچل رہے تھے.....وہ پڑھی لکھی خاتون تھی کہیں جاب بھی کر سکتی تھی مگر آفیسر بنتے ہی اس نے کہہ دیا تھا کہ تم نے صرف بچوں کی پرورش کرنی ہے اور خوب تعلیم دلوانی ہے....سارا گھر بار تمہارے ذمہ ہے۔

رافیہ خود چاہتی تھی کہ بچوں کی اچھی تربیت ہو....مگر....اس مہنگائی نے ان کی راتوں کی نیند اجاڑ دی تھی.... نہ جانے....اچھے حالات اتنے ناسازگار کیوں ہو گئے تھے۔

کام ختم کر کے وہ رفیق کے گھر کی کال بیل پر انگلی رکھ چکا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آ رہے تھے....رات اور بھی سیاہی مائل ہو گئی تھی....کچھ لمحوں پر صدر دروازہ کھلا اور رفیق اسے ڈرائنگ روم میں لے آیا.....

آج پہلی مرتبہ اس کا ڈرائنگ روم اس نے دیکھا تھا....بہت قیمتی اور عمدہ چیزوں سے آراستہ تھا....مہنگی مہنگی پینٹنگز اور سجاوٹ کی چیزیں نظر آ رہی تھیں....سلطانہ چائے کا ٹرے ڈرائنگ روم میں دے کر سلمان کے ساتھ سلام دعا کر کے جا چکی تھی۔

رفیق نے ایک کپ چائے کا بنایا اور سلمان کی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

اس کو پیو اور اب میری کہانی بھی سنو۔

سلمان نے اس کی جانب حیرت بھری نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔

جس زمانے میں تم ماسٹرز کر رہے تھے تو میں بی اے کا طالب علم تھا تم ڈگری لے کر چلے گئے تھے اور میں نے دو سال بعد ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی والدین نہایت ہی خوش تھے جیسے قارون کا خزانہ ان کے ہاتھ آ گیا ہو....پھر ان کی تمنا تھی کہ میں جلد نوکری پر فائز ہو جاؤں میں نے بڑے سکول اور کالجز میں اپلائے کیا مگر سفارش کے بغیر کہیں نوکری نا ملی تو ایک جج صاحب جب چیف بنے تو انھوں نے میری قابلیت کو دیکھتے ہوئے مجھے فون آپریٹر رکھ لیا تب مہنگائی کا گراف اتنا بڑا نہیں تھا والدین کی تمنا تھی کہ میری جلد شادی ہو جائے مگر ایک آپریٹر کو اچھے گھر رشتہ ملنا مشکل تھا میں نے انکار کر دیا جب تک بہتر جب ملے گی تو تب شادی کروں گا انھوں نے بھی یہ مناسب سمجھا....آپریٹری کے ساتھ ساتھ بہت تگ و دو کی مگر مجھ سے نالائق لڑکے سفارش کی وجہ

سے اچھی اچھی نوکریوں پہ فائز ہو گئے اور میں منہ دیکھتا ہی رہ گیا۔

کام سے فارغ ہو کر رات کے وقت لباس تبدیل کیا قمیض کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد گھر میں بے چینی محسوس کر رہا تھا تو گھر سے نکلا آبپارہ مارکیٹ کے قریب ایک تھڑے پر بیٹھ گیا ماں کے بول میرے کانوں میں گونج رہے تھے صبح کے لیے راشن گھر موجود نہیں ہے.... بار بار یہ جملے مجھے پریشان کر رہے تھے کہ صبح کیا ہوگا.... آسمان کی جانب دیکھا تو ایک ستارہ ٹوٹ کر رات کی تاریکیوں میں گم ہو گیا تھا.... آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کر کے گرنے لگے اور دل ہی دل میں اللہ سے فریاد کرنے لگا کہ تو ہی میری مدد کر سکتا ہے تیرے سوا اور کوئی نہیں.... میرا سر جھکا ہوا تھا ایک گاڑی میرے قریب آن کر رکی ایک صاحب گاڑی سے اترے شاید کوئی اشیاء لینے کے لیے جا رہے تھے تو اچانک ان کی نگاہ مجھ پر پڑی وہ جاتے جاتے رک گئے اور پوچھا کیوں رو رہے ہو.... ان کا اتنا ہی پوچھنا تھا کہ آنسوؤں کا سیلاب راستے بناتا ہوا گالوں پر پھسلنے لگا میں نے آنسوؤں سے بھرا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا تو ایک ہینڈسم نوجوان عمدہ سوٹ پہنے ہوئے مجھ سے مخاطب تھا۔

کیا ماجرا ہے.... آنسو مسلسل گالوں پر پھسلتے رہے اور میں بالکل خاموش رہا۔

وہ اتنی جلدی میں تھے.... کہ زیادہ رک نہیں سکتے تھے.... اپنے والٹ سے بغیر گنے کچھ نوٹ میری گود میں ڈال کر چلتے بنے.... میں حیرانی سے ان کو جاتے ہوئے دیکھنے لگا مگر کچھ نہ بولا.... آرام سے نوٹ جیب میں ڈال دیئے.... اس وقت کئی لوگوں نے جھولی میں روپے ڈالنے شروع کیے.... اور میں نے آسمان کی طرف دیکھا اور اللہ کا شکر ادا کیا.... ماں کی تربیت اس قسم کی تھی کہ اگر ان کو بتا دیتا تو انھوں نے ہاتھ بھی نہیں لگانا تھا۔ سلمان خدا گواہ ہے میں کسی سے کچھ نہیں مانگتا تھا مگر رات کو جھولی نوٹوں سے بھر جاتی.... ایک روز کا واقعہ ایسا کہ ایک شخص کہیں جاتے جاتے مجھے پریشان حال دیکھ کر اور میری پھٹی ہوئی قمیض دیکھ کر گاڑی روک کر پوچھنے لگا... کیا مسئلہ ہے۔

''جی میں نے ماسٹرز کیا ہے اچھی نوکری کی تلاش میں ہوں''۔

نوکری نہیں ملتی تو۔

تو چھوٹا موٹا کام کر لو۔

میرے اتنے وسائل نہیں ہیں.... آنسو پھر میری آنکھوں سے بہنے لگے... انھوں نے کہا۔

اگر تم سچے اور ایماندار ہو.... میں تمھارے

لیے کچھ کر سکتا ہوں.. کہاں تک تم نے تعلیم حاصل کی ہے... میں نے انگلش میں ماسٹرز کیا ہے... کسی سکول یا کالج میں نوکری مل جائے تو کتنی اچھی بات ہے... انسانیت کے ناطے پر آپ سے التجا کر رہا ہوں.. آپ بڑے بھلے آدمی دکھائی دے رہے ہیں۔

انھوں نے غور سے مجھے دیکھا اور کہا۔

سکول اور کالج کا وعدہ تو نہیں کرتا جیب سے ایک کارڈ نکالا اور میرے ہاتھ میں رکھا اور کہا۔

تم میرے دفتر اس پتہ پر پہنچو.... میں کوشش کروں گا تمہیں کوئی کام دلوانے کی۔ یکدم میں شادمان ہو گیا۔

خوشی اس قدر تھی کہ میں آسمان کو چھونا چاہتا تھا لیکن آسمان تو جھکتا ہوا میرے پاس آ رہا تھا... اور میں اسی وقت اٹھا اور تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے گھر پہنچ گیا۔

دوسرے دن میں اس کے دفتر پہنچ گیا۔

وہ ایک پراپرٹی ڈیلر تھا... اس نے کہا تم مجھے بہت ایماندار لگ رہے ہو... مجھ سے وعدہ کرو کہ ہمیشہ ایماندار رہو گے اور ایمانداری سے کام کرو گے تو میں تمہیں اپنے ساتھ شامل کروں گا.... ایک زمین بیچنے پر دونوں کو بہت فائدہ ہونے لگا۔ میری امی نے اچھے گھر میں میری شادی کر دی.... بچے ہوئے .... والدین رخصت ہوئے تو میرا کام دن بدن بڑھتا گیا... کیونکہ اس شخص کی اہلیہ وفات پا گئی... اور وہ اپنے بچوں جو کہ باہر کے ملک میں رہائش پذیر تھے ان کے پاس چلا گیا اور دفتر میرے حوالے کر گیا۔ .... اب مجھے ایسے شخص کی تلاش تھی کہ جو بہت ایماندار ہو... مجھے لگ رہا کہ تم اچھے انسان ہو..... اگر چاہتے تو اس نوکری میں محنت سے خوب روپیہ کما سکتے تھے.... میں نے بھیک نہیں مانگی تھی..... یہ سب میری ماں کی دعائیں تھیں..... جو کہتی تھی فکر نہ کرو مجھے امید ہے اللہ تمہیں غیب سے دے گا۔ یقین مانو میں نے بھی ایمانداری سے وقت پاس کیا ہے.....رزق حلال سے بچوں کو پالنا چاہتا ہوں..... میری کہانی امانت کے طور پر دل میں محفوظ کرنا میری بیوی تک کو علم نہیں... لیکن آج تمہاری ضرورت ہے چھوڑ دو سرکاری نوکری اور بزنس کرو..... اللہ مسبب الاسباب ہے۔ ہاتھ ملاؤ..... سلمان نے اس کی آنکھوں کی گہرائی میں سچائی دیکھی اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا..... اس کی آنکھوں میں شفق کے کئی رنگ اترنے لگے۔ اس کا چہرہ پھول کی طرح ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ اتنی خوش تھی کہ اپنے آپ کو بلندیوں میں اڑتے ہوئے محسوس کرنے لگا تھا۔

☆☆☆☆☆

تیاگ

کوئی اتنی حسین صبح میں ناخوش ہو بالکل ناممکن لگتا تھا۔ ایڈنا کو یقین تھا کہ اس کے سوا کوئی بھی اداس نہ تھا۔ گھروں کی کھڑکیاں کھلی پڑی تھیں اندر سے پیانو بجانے کی آواز آ رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھ پیانو کے اوپر کبھی ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے اور کبھی ایک دوسرے سے دور جا رہے تھے۔ باغوں میں اُگے درخت پتوں کی تالیاں بجا رہے تھے جبکہ بہار کی چمکیلی دھوپ میں رنگا رنگ پھول کھلے تھے۔ لڑکے گلیوں میں سیٹیاں بجاتے ہوئے گزر رہے تھے۔ ایک چھوٹا سا کتا بھونک رہا تھا اور آنے جانے والے لوگ ہلکے پھلکے قدموں سے تیز تیز چل رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے سب لوگ بھاگنے لگیں گے۔ اب وہ فاصلے پر آڑو کے پیڑ پر شگوفوں اور پھولوں کا چھپر سا دیکھ رہی تھی۔۔۔ سال کا پہلا چھپر۔

شاید ایڈنا خود بھی اتنی اداس نہ دکھتی تھی جتنا وہ اندر سے محسوس کرتی تھی۔ اٹھارہ برس کی عمر میں غمناک دکھائی دینا آسان نہیں ہوتا جبکہ آپ انتہائی حسین ہوں، گالوں اور ہونٹوں سے روشنی پھوٹ رہی ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے نیلے رنگ کا فرنچ فراک پہن رکھا ہو اور موسم بہار کے نئے ہیٹ میں پھول سجا رکھے ہوں۔ اس کی بغل میں ایک کتاب تھی جس کی سیاہ چرمی جلد تھی۔ شاید وہ کتاب اداس کی علامت لگتی تھی لیکن محض اتفاق تھا۔ یہ عام سی لائبریری کی جلد تھی۔ ایڈنا نے لائبریری جانے کا تو محض بہانہ بنایا تھا۔ وہ دراصل گھر سے باہر جا کر سوچنا چاہتی تھی کہ کیا ہو چکا ہے اور فیصلہ کرنا چاہتی تھی کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔

ایک حیرت ناک بات ہو چکی تھی۔ گزشتہ شب وہ اور جمّی تھیٹر کے ڈریس سرکل میں بیٹھے تھے۔ اس نے ابھی بادام والا چاکلیٹ ختم کیا تھا اور ڈبہ ایک بار پھر جمّی کی طرف

کیتھرائن منیز فیلڈ

ترجمہ: پیروز بخت قاضی

بڑھایا تھا کہ اچانک اسے ایک اداکار کے ساتھ عشق ہو گیا تھا___ لیکن کیا یہ عشق تھا___ محبت تھی؟

اسے زندگی میں ایسا احساس پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ یہ کوئی خوشگوار احساس نہ تھا اور نہ ہی اس میں کوئی تھرل تھا۔ کیا آپ مایوسی، ناامیدی، کرب اور دکھ کے احساس کو تھرلنگ کہیں گے؟ اسے یقین تھا کہ جب جمی گاڑی لینے جائے گا اور اس کے انتظار کے دوران اگر وہ اداکار اسے مل جائے تو وہ ایک ہلکا سا اشارہ پا کر اور جمی اور پاپا اور ماما اور اپنے گھر اور دوستوں کا خیال لائے بغیر دنیا کے دوسرے کنارے تک اس کے پیچھے جائے گی.....

پلے خوشگوار موڈ میں شروع ہوا تھا۔ یہ بادام والے چاکلیٹ کا مرحلہ تھا۔ پھر ہیرو اندھا ہو گیا تھا اور ایک خوفناک لمحہ آ گیا تھا۔ ایڈنا کے اتنے آنسو پہلے کہ اس نے جمی کا تہہ کیا ہوا رومال بھی تر کر دیا گیا تھا۔ اس وقت آنسو بہانا کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی کیونکہ تمام لوگ آنسو بہا رہے تھے حتیٰ کہ مرد حضرات بھی اپنی ناکوں کو بلند آواز سے صاف کر رہے تھے اور سٹیج کو دیکھنے کے بجائے پروگرام کو دکھ بھرے دل کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ جمی کی آنکھیں خشک تھیں۔ وہ اس کے رومال کے بغیر کیا کرتی___ وہ اس کے خالی ہاتھ کو دبا کر سرگوشی میں کہہ رہا تھا ”پیاری لڑکی! آنسو مت بہاؤ، خوش ہو جاؤ“

اس نے جمی کی خوشی کی خاطر اس وقت آخری بادام والا چاکلیٹ لے کر ڈبہ اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔ اس کے بعد وہ اندوہناک منظر آ گیا تھا، جس میں ہیرو سٹیج پر اکیلا رہ گیا تھا۔ خالی کمرے میں دھندلکا پھیلا تھا۔ باہر بینڈ بج رہا تھا اور گلی سے خوشی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ کتنی مشکل سے اپنی بے نور آنکھوں کے ساتھ کھڑکی تک جانے کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔ آخرکار وہ کھڑکی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہاں وہ پردے کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا جبکہ روشنی کی ایک کرن___ صرف ایک کرن اس کے اٹھے ہوئے چہرے پر پڑ رہی تھی جس چہرے میں آنکھوں کی بینائی مفقود تھی۔ ایسی حالت میں بینڈ کی آواز دور ہوتی جا رہی تھی.....

ایڈنا اور جمی ایک دوسرے کے ساتھ منسوب ہو چکے تھے۔ وہ ڈیڑھ برس سے اپنے بالوں کو نئے انداز سے اوپر اٹھا کر بنا رہی تھی۔ ان کی منگنی کی رسم ایک برس قبل ادا ہوئی تھی لیکن انھیں ایک دوسرے سے شادی کرنے کا علم بچپن سے تھا جب وہ اپنی اپنی آیاؤں کے ہمراہ باغ میں جاتے تھے اور گھاس پر بیٹھ کر بسکٹ اور چائے نوش کرتے تھے۔ یہ اتنی جانی پہچانی بات تھی کہ ایڈنا سکول میں ہر وقت ایک Imitation کو انگوٹھی پہنے رکھتی تھی جسے وہ منگنی کی انگوٹھی ظاہر کرتی تھی اور ابھی تک وہ ایک دوسرے کے لیے مختص تھے۔

لیکن اب یہ سب ختم ہو گیا تھا___ مکمل طور

پر ختم ہوگیا تھا۔ ایڈنا کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہوگیا تھا کہ جمّی کے اندر یہ احساس کیوں نہ جاگا تھا۔

وہ سیکرڈ ہارٹ کانونٹ کے باغ کی طرف مڑتے وقت دانائی کے ساتھ، اداسی کے ساتھ مسکرائی تھی۔ وہ اس راستہ پر چل پڑی تھی جو باغ کے بیچوں بیچ ہل سٹریٹ کی طرف جاتا تھا۔ اسی وقت یہ سب کچھ جان لینا کتنا اچھا تھا بہ نسبت اس کے کہ وہ شادی کر لیتے اور بعد ازاں وہ یہ سب کچھ جانتے۔ اب جمّی کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ حالات پر قابو پالے__ نہیں! اسے خود کو اس دھوکے میں نہیں رکھنا چاہیے۔ جمّی کبھی ان حالات سے سمجھوتہ نہ کر سکے گا۔ اس کی زندگی ٹوٹ پھوٹ جائے گی، تباہ ہو جائے گی۔ یہ لازمی امر تھا__ لیکن وہ ابھی نوجوان تھا۔ لوگ ہمیشہ کہتے آئے ہیں کہ وقت کے ساتھ کچھ کچھ بدل جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وقت کے ساتھ کچھ فرق پڑ جائے۔ چالیس برس گزرانے کے بعد جب وہ بوڑھا ہو جائے گا تب شاید وہ اس قابل ہو جائے کہ ایڈنا کے بارے میں سکون سے سوچے۔

ایڈنا راستے کے آخری سرے تک چوٹی پر پہنچ گئی۔ وہاں ایک درخت پر نئے شگوفے پھوٹ رہے تھے اور اس کی شاخوں پر سفید پھولوں کے چھوٹے چھوٹے گچھے لٹک رہے تھے۔ وہ اس درخت کے نیچے ایک سبز رنگ کے بنچ پر بیٹھ گئی اور کانونٹ کے پھولوں کے تختے دیکھنے لگی۔ قریب ترین تختے نازک سٹاک کے پھول کھلے تھے، جس کے کناروں پر پینزی کے پھولوں نے نیلا بارڈر بنا رکھا تھا جبکہ ایک کونے میں کریم رنگ کے فریزیا پھولوں کا ہجوم تھا، جس پر سبز رنگ کی چھوٹی چھوٹی برچھیاں سی بکھری تھیں۔ کانونٹ کے کبوتر ہوا میں بلندی پر محوِ پرواز تھے اور وہ سسٹر ایگنس کی آواز سن رہی تھی جو گانے کا سبق دے رہی تھی۔

''ہائے میں'' نن کی گہری آواز آئی اور ''ہائے میں'' کی گونج واپس آئی.....

اگر اس نے جمّی کے ساتھ شادی نہیں کرنی تو پھر کسی سے بھی شادی نہیں کرنی اور وہ مرد جس کے ساتھ اسے محبت ہوگئی تھی ____ وہ مشہور اداکار ___ ایڈنا کو اتنا شعور ضرور تھا اور وہ سمجھ سکتی تھی کہ یہ ممکن نہ تھا ____ عجیب بات ہے وہ یہ چاہتی بھی نہ تھی۔ اس کی محبت اتنی گہری تھی کہ اس کی تپش میں اسے خاموشی سے جلنا تھا، اس کا درد سہنا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی محبت ایسی ہی نوعیت کی ہے۔

''لیکن ایڈنا'' جمّی نے درد بھرے لہجے میں پوچھا تھا ''کیا تم کبھی نہیں بدل سکتیں؟ کیا میں پھر کبھی پُرامید نہیں ہو سکتا؟''

اوہ اس کا جواب دیتے ہوئے کتنا دکھ محسوس ہوتا تھا لیکن یہ بتانا ضروری تھا ''نہیں جمّی! میں کبھی نہیں بدل سکتی۔''

اسی لمحے مستقبل نظر آ گیا تھا۔ وہ حیران ہوگئی

تھی۔ پہلے تو اس کی سانس ہی رک گئی تھی لیکن پھر اس نے سوچا اس سے زیادہ قدرتی انجام اور کیا ہوسکتا تھا؟ وہ کانونٹ میں داخلہ لے گی۔ اس کے والد اور اس کی ماں نے اسے ارادہ بدلنے کے لیے بہت زور لگایا لیکن بے سود۔ اور جمّی کا ذہن اس بارے میں کچھ سوچنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ وہ سب لوگ کیوں نہیں سمجھ پاتے؟ وہ اس طرح اس کے دکھ میں کیونکر اضافہ کر سکتے ہیں؟ دنیا بڑی بے رحم ہے، دنیا بڑی ظالم ہے۔ اس نے اپنے زیورات اور دیگر اشیاء اپنی بہترین دوستوں کو دے دیئے۔ وہ اتنی پُرسکون تھی اور وہ سب لوگ اتنے دل شکستہ۔ اور پھر بالآخر وہ ایک کانونٹ میں چلی جاتی ہے۔ نہیں! بس ایک لمحہ ___ وہ شام جب وہ گئی ___ وہی شام وہاں اس سٹیج ڈرامہ کی آخری شام تھی۔ اداکار کو ایک اجنبی شخص نے ایک بکس پیش کیا جو سفید پھولوں سے بھرا تھا لیکن اس کے ساتھ کوئی کارڈ نہ تھا، کوئی نام درج نہ تھا۔ کچھ بھی نہیں تھا بس گلاب کے پھولوں کے نیچے سفید رومال میں لپٹی ہوئی ایڈنا کی آخری تصویر تھی، جس کے نیچے لکھا تھا دنیا کو بھولنے والے کے لیے اس کی جانب سے جسے دنیا نے بھلا دیا۔

ایڈنا درخت کے نیچے بالکل ساکن بیٹھی تھی۔ اس نے انگلیوں میں کالی کتاب پکڑ رکھی تھی جیسے یہ اس کی عبادت والی کتاب ہو۔ اس نے سسٹر اینجلا کا نام اختیار کیا۔ اس کے خوب صورت بال ___ تمام کے تمام کاٹ دیئے گئے۔ کیا اسے اپنے بالوں کی ایک لٹ جمّی کو بھیجنے کی اجازت ملے گی؟ کسی طرح اس کا بندوبست بھی ہو گیا۔ جسم پر نیلا گاؤن اور سر پر سفید بینڈ لگا کر سسٹر انجیلا کانونٹ سے چیپل اور چیپل سے کانونٹ جانے لگی۔ نگاہوں میں الوہیت، آنکھوں میں اداسی اور چہرے پر نرم مسکراہٹ جو اس کی طرف بھاگ کر آنے والے بچوں کو دیکھ کر نمودار ہوتی ہے۔ ایک صوفیہ! اور چیپل میں آنے زائرین کو ایک راہبہ کے بارے میں بتایا جاتا جس کی آواز دوسری آوازوں سے نمایاں سنی جاتی ___ اس کی جوانی، اس کا حُسن اور اس کی انتہائی المناک محبت۔ اس شہر میں ایک ایسا آدمی ہے جس کی زندگی تباہ ہوگئی.....''

شہد کی ایک بڑی مکھی، جس پر سنہری فر تھی، فریزیا کے ایک پھول میں چوری سے داخل ہوگئی اور نازک پھول جھک گیا ___ جھول گیا اور کانپ گیا اور جب مکھی اُڑ گئی ___ تو پھول ابھی لہرا رہا تھا، پھڑ پھڑا رہا تھا جیسے قہقہے لگا رہا ہو ___ مسرور اور لاپرواہ پھول.....

سسٹر اینجلا نے اس کی طرف دیکھا اور کہا ''اب سرما آ گیا ہے''۔ ایک رات اپنے چھوٹے سے برفیلے کمرے میں لیٹے لیٹے اسے رونے کی آواز سنائی دی۔

باغ میں کوئی اکیلا جانور تھا۔ شاید بلی کا بچہ یا

بھیڑ کا بچہ یا کوئی اور ننھا جانور ہوگا۔ ویران نیندوں والی راہبر انھی جو سر سے پاؤں تک سفید پیراہن میں لپٹی تھی، بے خوفی سے لیکن کانپتے بدن سے باہر نکلی اور جانور کو اندر لے آئی۔ لیکن اگلے روز جب صبح کی عبادت کے لیے گھنٹی بجی تو وہ تیز بخار میں مبتلا پائی گئی۔ اس پر خوف اور پریشانی طاری تھی جس سے وہ کبھی شفایاب نہ ہوسکی___

تین روز میں سارا قصہ تمام ہوگیا۔

جنازہ پڑھا گیا اور اسے قبرستان کے اس کونے میں دفنا دیا گیا جو راہباؤں کے لیے وقف تھا اور جہاں قبروں پر لکڑی کی سادہ اور چھوٹی چھوٹی صلیبیں نصب تھیں۔ سسٹر اینجلا! اب پُرسکون مرقد میں آرام کرو.....

اب شام ہو چکی تھی۔ دو بوڑھے ایک دوسرے پر جھکے ہوئے مرقد پر بیٹی! ہماری اکلوتی بیٹی"۔ اور پھر ایک اور شخص آیا۔ وہ سیاہ کپڑوں میں ملبوس آہستہ سے آیا۔ لیکن جب اس نے مرقد پر پہنچ کر اپنی سیاہ ماتمی ٹوپی اتاری تو ایڈنا نے اسے خوفزدہ ہو کر دیکھا کہ اس کے بال برف کی طرح سفید ہو چکے تھے۔

جمی بہت دیر کر دی! بہت دیر ہوگئی۔ جمی کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور پھر وہ بلند آواز سے رونے لگا۔

بہت دیر ہوگئی تھی، بہت دیر ہو چکی تھی۔ گرجا گھر کے احاطہ میں تیز ہوا سٹنڈ مُنڈ درختوں کو ہلا رہی تھی۔ اس نے ایک کربناک اور ڈراؤنی چیخ ماری۔

ایڈنا کی کالی کتاب باغ کے راستہ پر تھپ سے گر گئی اور وہ اچھل پڑی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ نہیں میرے محبوب! زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ یہ سب ایک غلطی تھی، ایک ڈراؤنا خواب تھا۔

ہائے! یہ سفید بال! وہ کب اس کے بالوں میں سفیدی چاہتی تھی۔ اس نے تو ایسا نہیں کیا___ اوہ خدایا! یہ کیسی جنت ہے؟ یہ کیسی خوشی ہے؟ وہ آزاد اور جوان تھی اور کسی کو اس کا راز معلوم نہ تھا۔ اب بھی اس کے اور جمی کے لیے سب کچھ ممکن تھا۔ انھوں نے جس گھر کا منصوبہ بنایا تھا وہ اب بھی تعمیر ہوسکتا تھا۔ اپنے ہاتھ کمر کے پیچھے کر کے انھیں گلاب کے پودے لگاتے ہوئے دیکھنے والا ننھا لڑکا اب بھی پیدا ہوسکتا تھا۔ اس کی آیا.....

لیکن جب ایڈنا بچے کی آیا تک پہنچ گئی تو اس نے اپنے بازو پھیلا دیئے جیسے اس کی معصوم محبت ہوا کے دوش پر اُڑتی ہوئی اس کے پاس آگئی ہو___ باغ پر نظر ڈالتے ہوئے، درختوں پر سفید پھول کھلتے، دیکھ کر آسمان پر نیلے کبوتر اُڑتے دیکھ کر اور کانونٹ کی تنگ کھڑکیوں کو دیکھ کر اس نے بالآخر محسوس کر لیا تھا، اسے زندگی میں پہلی بار یہ احساس ہُوا تھا اور اس سے پہلے اس نے کبھی ایسا محسوس نہ کیا تھا، وہ جان چکی تھی کہ محبت کرنا کیا ہوتا ہے۔ لیکن محبت___ اور اس میں!

☆☆☆☆☆

''نہیں، میں اُداس نہیں ہوں''

سرما کی شاموں کی پہلی علامت اداسی ہے مہینہ پہلے اس وقت ہا کر کی گھنٹیاں بجتی تو بچوں کی کھنکھناتی آوازیں - کرکٹ کی گیند کی دھمک کے پس منظر میں دیر تک باہر کی دُنیا آباد رکھنے کا ساز بینہ سنائی دیتا تھا- اور اب ٹھیلے کی اس ٹن ٹن میں گرجا گھر میں آخری جرس کی تھکن ہے- تحفظ بھری چار دیواری میں پناہ لینے کی لپک ہے-

تو اَے تاریکی میں ٹھٹھرتے ستونوں! میں کمرے میں پناہ لینے جارہی ہوں- تنہائی میں تنہا رات کا آغاز کرنا خوف کا استقبال کرنا ہوتا ہے- تنہائی سے گریز پا ہم انسان بچارے تنہائی کے سمندر میں بے دست و پا تنکے کی طرح ڈبو دیے جاتے ہیں-

کیا کبھی اجنبی سیارے میں تنہا جا بسنے کا سوچا لڑکی؟

لڑکی؟؟

''ہاں چڑیا کے دل والی گڑیا سی لڑکی''

''تمھارے بھی بغیر؟''

''ہاں میرے بھی بغیر''

''وہاں تمھاری دل موہ لینے والی آواز بھی نہیں ہوگی؟''

''نہیں..... وہاں کچھ بھی یہاں جیسا نہیں ہوگا..... بولی نہ سوچ نہ آواز نہ شکل''

عجیب سگندل محبوب تھا- دل توڑ دینے والی سچائیاں بے دریغ بول دیا کرتا تھا-

مگر کیا دل کا ٹوٹنا..... اپنے پن کی حرارت بخش پیالیاں نرم لحاف، ''ہم'' کا سرمئی حصار جن کی چھ حسیات تصدیق کریں مگر ہوتا سچ نہیں یہ مصدقہ سُراب.....

اے پنجرے میں آنکھیں مُوند کے اُونگھتے پرندے!

اندھیری رات ہو، پنجرہ چھن جائے - راستے معلوم نہ ہوں، حملہ آور گھات میں ہوں تو کیا ہوگا؟ ارے بچے کچھ نہیں ہوگا یہ جو بیت رہا ہے سے، یہ جو صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے یہ درحقیقت نہیں ہوتی-

دردانہ نوشین خان

اے پام کے مرجھاتے پودے! تمھیں تو سمجھ آتی ہوگی میری بات ..... یہ نئے نئے کھلے پھول ابھی اپنی مستی میں ہیں۔ ہر حاصل کنندہ مستی میں ہوتا ہے۔ جب حاصل لاحاصل ہو جاتا ہے، تب سمجھ کا کیا فول تب تو سمجھ کی حکمرانی ہوگی۔ جاتی تاریخوں کے نا انتظار کیے جانے والے چاند!

تُم تو نہ پوچھو اُداسی کیا ہے؟ بلکہ تُم بتاؤ، بتاؤ کہ اُداسی منہا ہو جانا ہے۔ سادہ سا جواب دو تو اُداسی فنا ہے مگر نہیں یہ جواب درست نہیں ہے۔ اگر فنا کو فنا آ جائے تو اُداسی نہیں ہوگی؟ اگر اذیت درد تکلیف کسمپرسی لافنا ہو جائے تو اُداسی کی بدصورت ترین شکل ہوگی۔ بلکہ..... یار..... وہ اداسی نہیں مایوسی ہوگی۔

اُداسی میں لطافت ہے، اداسی بلیک نہیں گرے ہے۔ اداسی سکھانے کی رمق رکھتی ہے۔

اے خاموشی کی گرد و غبار میں اَٹے بوسیدہ دروازے! بتا..... اداسی کیا ظاہری تنہائی میں اُگتی ہے؟

کیا تُو نے شہنائیوں کے رقص میں کُرسی پہ سر ڈالے نیم وا تکتے اُداسی کو نہیں دیکھا؟

یہ تو قہقہوں کی پھلجڑیوں میں Hidden ہو سکتی ہے فُل میک اَپ تزئین و آرائش میں دبی ہو سکتی ہے۔ مہنگے ترین ٹکٹ کے جہاز میں اُڑتے ہوئے ہو سکتی ہے البتہ اُداسی منافقت کی ماہر ہے۔ اس کا ظاہر کبھی باطن سے نہیں ملتا۔

اے گلابی ٹہنی جیسی لڑکی!

جب تارہ ٹوٹا تھا تُم نے کیا مانگا تھا؟

اب اسے کیسے بتاؤں میں نے ہماری مغفرت مانگی تھی۔

شاید یہ جواب اُسے اُداس کر دیتا اُس کے تاثرات مجھے اداس کر دیتے۔

آخر کیا مصیبت ہے کیا میں تھوڑی دیر کے لیے اُداسی کو الماری میں رکھ کر تالہ نہیں لگا سکتی؟

مگر میری الماری کا تو تالہ نہیں ہے بلکہ کنڈی ہی نہیں ہے اداسی کو میں جتنی چیزوں کے پیچھے دھکیل کے رکھ آؤں یہ پالتو بلی کے طرح پل بھر میں پھلانگ کر پھر میرے دوارے آ جاتی ہے۔

ہاں میں نے ایک منظر کو جتنی بار ٹٹولا ہے اس میں اداسی کو نہیں پایا۔

نجو خالہ کی بان کی چارپائی جس کی پائنتی پہ پُرانے کھیس کی بچھوتی..... سرما ہو یا گرما کا صحن..... پیلے پھولوں والا شگفتہ مہک دار درخت ..... فضا میں تبسم بھری مٹھاس..... تبرک کے لفافوں جیسی پاکیزہ خوشی..... سب کی خیر سب کا بھلا کا عملی مظاہرہ۔

مگر اب سوچتی ہوں جب شام رات میں ڈھلتی ہوگی پیلے پھولوں والا درخت لاتعلقی کی نیند اوڑھ لیتا ہوگا۔ بان کی چارپائی اُداس ہو جاتی ہوگی۔

وہم جماعت کی نئے پھولوں جیسی الھڑ

لڑکیاں اور فیرویل پارٹی تھی۔ سلک کے مسٹرڈ غرارہ سوٹ میں میز پر بیٹھی منتہیٰ نے گیت سنایا تھا۔

غم دل کو اِن آنکھوں سے چھلک جانا بھی آتا ہے ہم سب جھوم جھوم کے سُن رہی تھیں۔

خدا کی قسم لے لو جو پتا ہو کہ غمِ دل کیا ہوتا ہے، تب غمِ دل کی الف ب معلوم نہ تھا۔

محبت؟ لگتا تھا محبت تو رسالوں کے افسانوں میں ہوتی ہے کوئی جل پریاں شہزادوں سے کرتی ہیں، جن کے کہیں زمستانی پہاڑیوں میں بنگلے ہوتے ہیں۔

مگر وقت کی گرد آلود آندھی نے وہاں لا پھینکا جہاں غم دل کی نادر یافت قسمیں بھی دریافت ہو گئیں اور وہ مسٹرڈ سلک کے غرارے والی منتہیٰ مرحومہ کے البم میں جمع ہو گئی۔

یہ جو ہمارے ہاں کثرت سے مستعمل اشعار اقوال ہیں:

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
زندگی یوں تمام ہوتی ہے

یا

دن ہیں زندگی کے بیتتے جاتے

یہ صبح سے شام ہونے اور بیتتے جانے کا اظہار تھکن کیا ہے؟

ذرا سوچو..... اگر eternity ہے ابدیت ہے صبح سے شام ہوتی رہے کیا فرق پڑتا ہے۔ فرق آخری کا خدشہ ہے.....

تم نے کہا تھا ناں کہ جب ہم نہ ہوں گے تب بھی دُنیا اسی طرح رواں دواں ہو گی۔ تم اس کا جواب جانتے تھے پھر بھی تم نے کہا تھا۔

اب جب ہم میں سے ایک ہے دوسرا نہیں ہے۔ ایک جو ہے وہ گواہ ہے کہ دُنیا اسی طرح رواں دواں ہے۔ پُوری دھوم اور پورے جوش سے ہے۔ چھلیاں گرم بیچنے والا بھی آتا ہے۔ تیسری منزل کی مُنڈی پہ چیل بھی بیٹھتی ہے۔ نیلے آسمان پہ بدلیاں بھی تیرتی ہیں۔

اونچے پام نے سر ہلا کر گویا پوچھا تھا۔

''تم جھلی تو نہیں ہو؟''

کیا تم میرے بیٹے بنو گے..... یا بھائی؟..... محبوب؟ میرا کوئی نہیں ہے

سنسان ویران حویلی میں اِدھر سے اُدھر چلتی جھلی نے رُک کر اپنا سوال داغ دیا۔

بچاری ماضی میں جیتی ہے۔

جیتی ہے؟ کون جیتی ہے؟ اسے تو مرے کئی سال ہو گئے ہیں۔

وہ جولا ولد بیوہ اُستانی اکیلی رہتی تھی۔ اُس کا مکان فروخت ہوا ہے۔ مکان کیا تھا اچھا خاصا بھوت بنگلہ تھا۔ اتنے بڑے اور ویران بنگلے میں کوئی عورت کیسے برسوں تنہا رہ رہی تھی۔ مگر آس پاس والے جانتے ہیں کہ وہ رہ رہی تھی تاہم لوگ یہ نہیں جانتے وہ عورت نہیں اُداسی تھی۔

اُداسی ہمیشہ تنہا جیتی ہے، تنہا مرتے تو سب ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

کوہ گراں

آج وہ اپنے کالج کے کامیابی کے سب سے اُونچے چبوترے پر کھڑی تھی - زندگی کی وادی اُس کے سامنے تھی - - - - سرسبز شاداب - - - ہر طرف نظارے ہی نظارے تھے - آج وہ جیت چکی تھی - ڈگری - - - اُس کی سب سے بڑی تعلیمی ڈگری اُس کے ----- شل ہاتھوں میں تھی- آنسوؤں کی جھڑی اُس کے رخساروں پر پھسل رہی تھی- اُس کی کامیابی کو کوئی دیکھنے والا نہیں تھا - - - ماں باپ - - - بہن بھائیوں سے دُور - - - سات سمندر پار - - - ہمت و عزم کا پہاڑ آج پہلی بار پسیج گیا تھا- آنسوؤں کی ٹپ ٹپ سے وہ خود ہی بھیگ رہی تھی- وہ جھکنا چاہ رہی تھی- اُس نے تصور باندھا - - - ماضی کے جھروکوں سے اُسے ایک کھلی کھڑی نظر آئی جس سے اُس نے سیکھا تھا کہ دنیا کی سب سے بڑی کامیابی پر سر سجدہ میں جھکا دیا جاتا ہے- وہ سجدہ میں جھکنا چاہتی تھی - - - جھک نہ سکی - - - اس کا نچلا دھڑ اُس کے کنٹرول میں نہیں تھا- اُسے وہ سب کچھ یاد آیا جسے وہ یاد نہیں کرنا چاہتی تھی- اُس کے جسم کا نچلا حصہ سالم نہیں تھا - - نیم مردہ تھا - - - تین چوتھائی حصہ بے حس تھا - - وہ بے حس نہیں تھی لیکن جسم کا یہ والا حصہ بے حس ہو گیا تھا! وہ اُس کے کنٹرول میں نہیں تھا - - - وہ چیخنا چاہتی تھی - - - - - ٹوٹ کر رونا چاہتی تھی پر نہیں - - - - - آنسوؤں میں اضافہ ہوتا گیا- ہمت کا پہاڑ کھڑا تھا پر کہاں - - - وہیل چیئر کی گود میں - - -!!

یہ آپی انعم نجم کی داستانِ حیات ہے- وہ ایک مثالی طالبہ تھی- اکیس سالہ انعم زندگی سے بھرپور تھی - - - زندگی کی اُمنگیں اس کے اندر سانس لیتی تھیں - - اٹکھیلیاں کرتی روشن جگ مگاتی زندگی کی وہ مالک تھی- اُسے لگتا

نجم رضوی

زندگی کی تمام خوب صورت شامیں اُس کی ہیں ---دن اُس کے ہیں ---- اور جھلملاتے ستارے --- سارے کے سارے اُس کے ہیں-- اور وہ اُن روشن چمکتے ستاروں کو ایک دن اپنی چلمن میں ٹانک لینا چاہتی تھی - انہی روشن گنگناتی بھرپور راتوں میں سے ایک رات وہ مری روڈ سے اپنے گھر مظفرآباد کی طرف بڑھ رہی تھی- وہ کزن کی مہندی سے واپس گھر جا رہے تھے-وہ نومبر کی ٹھنڈی رات تھی- رات کا فنکشن تھا اور وہ کافی لیٹ بھی ہو گئے تھے- ماں، باپ اور وہ کار میں سوار تھے- اُس کے پاپا گاڑی چلا رہے تھے-

اچانک سڑک پر اُن کے سامنے ڈاکو آ نکلے تھے- وہ تو سو رہی تھی- ماں کے کندھے پر سر رکھ کر---- ماں کا بازو اُس کے کندھے کے گرد حائل تھا- وہ تو سوتی رہ گئی لیکن زندگی کا کانٹا بدل گیا--- زندگی کے مطالب بدل گئے- ڈاکوؤں نے لوٹنے کے لیے، اُن کو روکنے کی کوشش کی لیکن انعم کے پاپا نے شاید کمال بہادری میں لُٹنے سے بچنے کی کوشش میں، سڑک پر بچھائی گئی رکاوٹوں سے گاڑی بچاتے ہوئے، اپنی کار دوڑا چکے تھے- وہ گاڑی دوڑاتے گئے اور پیچھے سے ڈاکوؤں نے تین چار فائر کیے- پستول کے فائر گاڑی میں آ لگے - انعم کے پاپا بچ گئے- ماں بھی بچ گئی- وہ حیرانی و پشیمانی میں گاڑی دوڑاتے محفوظ مقام، ایک ہوٹل تک پہنچ چکے تھے- اُن کے ہاتھ کانپ رہے تھے- انھوں نے انہونی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی- کچھ بھی ہو سکتا تھا- اُنھوں نے گاڑی روکی - اپنی بے ترتیب سانسیں درست کرنے لگے- اپنی گھبراہٹ دور کی- انھوں نے اپنی بیوی کو سہارا دے کر کار سے نیچے اُتارا- وہ بچاری، ڈری ہی تھی "اللہ توبہ --- میری توبہ" کا ورد کر رہی تھیں- وہ سمجھ رہے تھے کہ انعم رانی سو رہی ہے اور اُسے کسی بات کا پتہ نہیں ہے- اب اُنھوں نے انعم کو نیند سے بیدار کرنے کی کوشش کی- اُنھوں نے دیکھا کہ انعم نیند سے بیدار ہو چکی ہے لیکن اُس سے گاڑی سے نیچے نہیں اُترا جا رہا- وہ اپنی جگہ سے ہلنے کے قابل نہیں تھی- منہ سے الفاظ بھی نہیں نکل پا رہے تھے- بس ہونٹ ہلے جا رہے تھے- وہ ہمت کر کے بھی اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت نہیں دے پا رہی تھی - انعم کے پاپا فوراً "انعم --- انعم" پکارتے اُس کی طرف لپکے- وہ بظاہر بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہی تھی- اُنھوں نے سہارا دے کر انعم کو گاڑی سے نیچے اتارنے کے لیے اپنا سر سیٹ کی پچھلی طرف کیا تو اُن کی چیخ نکل گئی- کیا دیکھا وہاں تو خون ہی خون تھا--- انعم کی شال--- اور پہنی اُون کی موٹی جرسی خون میں لت پت تھی---- پستول کی گولی انعم کی ریڑھ کی ہڈی میں لگ چکی تھی

جس کی وجہ سے انعم کا اپنے جسم پر کنٹرول ختم ہو گیا تھا۔ جیسے والدین سے اپنے بچوں کے دُکھ نہیں دیکھے جاتے۔ وہ بلبلاتے شہر کے بڑے ہسپتال کی طرف گاڑی دوڑانے لگے۔

زندگی کی رُت بدل گئی۔ یکدم خزاں آگئی۔ ڈاکٹروں کی دوڑ دھوپ سے انعم کی جان تو بچ گئی تھی لیکن ظالم گولی نے سپائنل کارڈ کو damage کر دیا تھا اور نظام عصاب کی باریک نسوں کو کتر ڈالا تھا۔ اُس کے جسم کا تین چوتھائی حصہ بے کار ہو چکا تھا۔ انعم سر سے لے کر تقریباً کندھوں تک زندہ تھی۔۔۔ انعم کار آمد تھی۔۔۔ باقی مفلوج۔۔۔ بے کار۔۔۔ بے سود۔ زندگی کا سب سے کٹھن مرحلہ شروع ہو چکا تھا۔ اُس کے ہاتھوں پر۔۔۔ بازوں پر باہر کی طرف sensation تھی لیکن اندر کی طرف نہیں۔ بلڈ پریشر کے اشیوز شروع ہو گئے۔ بی پی یکدم کبھی ہائی ہوتا تو۔۔۔ تھوڑی دیر بعد low ہو جاتا Urine۔ پر اُس کا کنٹرول ختم ہو کر رہ گیا۔ اُس کے جسم کے مختلف حصے تپش سے جلنے لگتے۔ اسے اپنے پاس پانی کی ٹھنڈی تھیلیاں رکھنا پڑتیں۔ جسم کے عصابی ٹشوز میں ایسی بے چینی اور درد شروع ہو جاتی کہ جس کی سمجھ ہی نہیں آتی تھی اور انعم کی تکلیف بڑھ جاتی۔

چند ہی ماہ بعد انعم کا واسطہ ایک ایسے جسم سے پڑ گیا جس کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔ وہ اپنی انگلیوں کو۔۔۔ ہتھیلیوں کو اچھی طرح اور اپنی مرضی سے حرکت نہیں دے سکتی تھی۔ ایک کٹا پھٹا جسم باقی رہ گیا تھا۔ وہ ایک انجان جسم کی مالک بن گئی تھی۔ جسم کے اس رویے پر وہ بہت پریشان ہو جاتی۔ ڈاکٹروں کی مسلسل کوششوں سے وہ گھر منتقل ہو گئی اور اپنی زندگی کو گھسیٹنے لگی۔

وہ بیڈ کی ساتھی بن گئی اور لیٹے لیٹے تھک جاتی۔ جسم سو جاتا اور دماغ جاگ جاتا۔ الحمدللہ اُس کا دماغ بالکل تندرست تھا۔ وہ لوگوں کے مختلف رویوں کا مشاہدہ کرنے لگی۔ لوگوں کی امید بھی تو تندرست جسم سے ہوا کرتی ہے۔ اُس کے استاد کے کسی اچھے وقت میں کہے ہوئے یہ الفاظ ”انعم بی بی! اپنے جسم پر اتنا ترس نہیں کھاتے۔ یہ بڑا کام چور ہے۔ اسے جتنا زیادہ استعمال کیا جائے اُتنا ہی تندرست رہتا ہے۔“ اِس وقت، زندگی کی سیاہ رات میں، یہ جملے روشن مشعل کی طرح اس کے کام آئے۔ پھر اُس نے اپنے اُوپر ترس کھانا چھوڑ دیا۔ پھر کیا تھا کام۔۔۔ کام اور بس کام۔

اِس دوران دو باتوں نے انعم کو بہت ہمت دی۔ ”انسان کو وہی کچھ ملتا جس کی وہ سعی کرتا ہے“ اور ”ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔“ القرآن۔ اور یہ شعر کا مصرعہ ”ابھی تو عشق کے امتحاں اور بھی ہیں“ اُس کی

زندگی کو بدلنے کے لیے کافی تھے۔ اُس نے سوچا اگر یہی حقیقت ہے تو چلو پھر محنت کر کے دیکھتے ہیں۔ جب وہ شعر کا مصرعہ گنگناتی تو مسکرا کر کہتی، ''اگر زندگی امتحان ہے تو چلو پھر اس عشق کے امتحان کو دے کر دیکھتے ہیں۔'' وہ اس سوچ کی مالک تھی، smile even if your heart is bleeding اس کا دل چاہیے لہولہو تھا لیکن اس کے چہرے پر ہمیشہ مسکان رہتی۔ وہ کبھی جب وہ خود کلامی کرتی، ''اگر زندگی نے لیمن بنا دیا ہے تو اس کا lemonade بنا کر دیکھتے ہیں۔'' اُس کی مزاح کی حس مردہ نہیں ہوئی تھی۔ خدا کا شکر تھا کہ وہ اِس مشکل کے دُور میں ڈپریشن میں نہیں گئی تھی۔ اُس کی صرف ایک ہی وجہ تھی کہ اللہ سے اس کا رابطہ بہت مضبوط تھا۔ ویسے تو وہ شروع سے ہی بڑی شائی اور کم گو تھی۔ جب اُس نے میٹرک کے امتحان میں، مائی بیسٹ فرینڈ، کا مضمون آیا تھا، Allah is my best Friend. اُس نے اِس عنوان پر ایک لمبا چوڑا مضمون لکھ دیا تھا۔ اِس بستر پر بھی جہاں اُس کی سانسیں چل رہی تھیں۔۔ اللہ سے اُس کے لگاؤ کا اظہار ہوتا ۔۔۔ اللہ سے باتیں ہوتیں ۔۔۔ سرگوشیاں ہوتیں اور کہا جاتا، ''I miss YOU'' کبھی کبھار تو وہ جھوٹی موٹی اللہ سے ناراض بھی ہو جاتی تھی لیکن جلدی ہی مان جاتی۔ اُس کو اپنے گرد کسی کی موجودگی کا بھی احساس ہوتا۔ عجیب تعلق تھا نہ دکھائی دینے والا اُس کے بہت قریب ہوتا ۔۔۔۔ اور وہ اُس کی presence کو feel کرتی۔

اچھا، انعم پر اللہ کا خاص فضل تھا کہ اِس ساری صورت حال میں بھی اُس نے کبھی اُس ذات کا گلہ نہیں کیا تھا۔ کبھی نہیں سوچا تھا کہ آخر اُس کے ساتھ ہی ایسا کیوں۔ اگر کبھی کوئی سہیلی کہہ ہی دیتی، ''دیکھ انعم! خدا نے تمھارے ساتھ کیا کیا ہے؟؟۔ آخر تم ہی کیوں'' تو وہ کمال حوصلے سے اُس کے لبوں پر انگلی رکھ کر دیتی، ''not at all'' بلکہ وہ بڑے فخر سے کہتی، '' I am the selected one.... '' وہ اُلٹا کہتی، ''وہ خدا جس کی مرضی کے بغیر تو کوئی پتہ بھی نہیں گر سکتا ----- کتنا کریم ہے ----- وہ میری چھوٹی چھوٹی حرکت پر بھی نظر رکھتا ہے ---- میں اُس کی نگاہِ کریمہ میں ہوں ---- وہ عظیم --- اور کہاں میں حقیر ----!!'' وہ بڑبڑاتی اور کہتی، ''شکر ہے ---- میں گناہ کے بھنور میں گرنے سے بچ گئی --- اب میرے ہاتھ پاؤں گناہ کی طرف نہیں اُٹھ سکیں گے۔'' وہ اللہ کا گلہ کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ گلہ کیسے کر سکتی تھی؟ ایک عبد اپنے معبود سے ---- ایک بندہ اپنے مالک سے کیسے گلہ کر سکتا ہے لیکن اس

کی اپنی ہی منطق تھی۔ وہ کہتی، ''سچی بات ہے — میں نے اپنی صحت مند -- پچھلی اکیس سالہ زندگی میں اُس کی ہر نعمت کا --- بن مانگے ملنے والی ہر نعمت کا کہاں ایسے شکر ادا کیا ہے جیسے شکر ادا کرنے کا حق ہے۔ وہ تو فرماتا ہے میری نعمتوں کو شکرانے سے قید کرلو۔ میں قید نہ کرسکی اُس کی نعمتوں کو! --- اب شرافت کا --- عدل کا تقاضہ ہے کہ اگر مصیبت آگئی ہے تو کم از کم اکیس سال تو اپنے رَب سے اپنی تکالیف کی شکایت نہ کروں ---!!!''

نعمت کے چھن جانے کا ہر انسان کو دُکھ ہوتا ہے۔ وہ اپنی اس زندگی میں ایسی رچ بس گئی تھی کہ اگر کوئی اُس سے اپنی زندگی تبدیل کرنا چاہتا تو وہ نہ کرتی۔ وہ کہتی، ''میں اِس زندگی کی عادی ہو چکی ہوں -- میں اس کے گُر سیکھ چکی ہوں۔'' اُسے سب سے زیادہ تکلیف اور دُکھ اس بات کا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے بارگاہِ ایزدی میں ،اپنی پیشانی سجدہ میں نہیں رکھ سکتی تھی۔ یہ جو سجدہ کی لذت اس سے روٹھ گئی تھی اُسے سب سے زیادہ تکلیف اِسی بات کی تھی۔ اُس کے nerves اُس کا کہنا نہیں مانتے تھے۔ اُس کی ریڑھ کی ہڈی اُس کا بوجھ نہیں اُٹھاتی تھی۔

کامیابی کے اِس چبوترے پر اُسے یاد آیا کہ کیسے جب وہ ہسپتال سے گھر منتقل ہوئی تھی اور وہ کچھ بہتر محسوس کر رہی تھی تو سارے لوگ سمجھ رہے تھے کہ زندگی کے تمام دروازے اُس پر بند ہو گئے ہیں۔ اُس نے ضد شروع کر دی کہ وہ اپنی میڈیکل کی پڑھائی وہاں سے دوبارہ شروع کرے گی جہاں سے منقطع ہوئی تھی۔ سارے اُسے دیوانہ سمجھتے ۔ وہ کہتی، ''میرا جسم میرے ارادے کو نہیں توڑ سکتا --- پھر کیا ہوا اگر میرے ہاتھ --- ڈاکٹر بن کر مریض کو چھو نہیں سکتے — پر میں Psychiatrist بن کر بن چھوئے اُن کی روح کے مرض کا تو جان پاؤں گی ----- چہرہ کے تاثرات — اور باتوں سے مرض کی تشخیص کروں گی --- یہ تو میرا ایک پڑاؤ ہوگا --- میری منزل اس سے آگے ہوگی! اُس کی ضد اور اصرار بڑھتا گیا۔ سب سے اہم مسئلہ دوبارہ سے پڑھائی شروع کرنا تھا۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ میڈیکل کالج گئی ۔ چیئرمین اور پرنسپل صاحب سے بات کی۔ بڑے غور وخوص اور انعم کا مصمم ارادہ دیکھتے ہوئے اُسے دوبارہ سے تعلیم جاری رکھنے کی اجازت ملی۔ کالج انتظامیہ نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ میڈیکل کالج کی بلڈنگ کئی منزلہ تھی اور مختلف کلاسز مختلف فلور پر ہوتی تھیں۔ انعم کے لیے، رحمدل انسان شناس پرنسپل صاحب نے، انعم کی ویل چیئر کو پیچھے سے پکڑتے ہوئے کہا تھا، ''انعم بہت بہادر

ہے۔ یہ اِس کالج کی بیٹی ہے---اِس کا اتنا حق تو بنتا ہے---، اگر یہ اتنی ہمت کر سکتی ہے تو ہم معمولی سی changes کیوں نہیں کر سکتے---- میں اِس کے لیے سال سوئم کی تمام کلاسز گراؤنڈ فلور پر ایڈجسٹ کروا دیتا ہوں ---اِس کی ویل چیئر کے لیے کوئی مسئلہ نہ رہے--- ''سر نے بڑے فخر سے انعم کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُس کے ساتھ تصویر بھی بنوائی تھی--- ''تم ہمارا فخر ہو!!'' کہا تھا۔

انعم کو گھر سے اُٹھا کر گاڑی میں رکھنا اور پھر کالج لے کر جانا---- جان جوکھوں کا کام تھا۔ پھر ویل چیئر پر سارا دن ایک کلاس سے دوسری کلاس تک لے کر جانا، یہ مشکل کام انعم کے والدین نے بڑے احسن طریقے سے ادا کرنا شروع کر دیا۔ زندگی کا تلخ وقت شروع ہو چکا تھا۔ صرف بڑے دل گردے والے ایسے حالات کا سامنا کرتے آئے ہیں۔ انعم کے ہاتھوں کی مسلسل تھرا پی ہوتی رہی تھی۔ وہ اِس قابل ہو گئی تھی کہ ہاتھ کی ہتھیلی پر الاسٹک بینڈ چڑھا کر قلم تھام سکے۔ اِس سے وہ آہستہ آہستہ کچھ نہ کچھ لکھنا شروع ہو رہی تھی۔ سب سے بڑی مصیبت تھی کہ وہ ڈائپر میں کالج آتی اور بعض اوقات کالج میں ہی اُس کو ڈائپر تبدیل بھی کرنا پڑتا۔ کھانا کھاتے ہوئے، چمچ کا پکڑنا خاصا مشکل تھا اگر وہ اس کو کسی طرح پکڑ بھی پاتی تو انگلیوں کی مدد سے روٹی کے ٹکڑے کرنا اس کے لیے ناممکن تھے۔ روٹی کے چھوٹے چھوٹے نوالے اُس کی ماں بنا دیتی تھی۔ وہ مسکرا کر کہتی ''ماں! میں کتنی خوش نصیب ہوں کہ ساری زندگی تیری چھوٹی سی گڑیا بن کر ہی رہوں گی!'' ماں کی آنکھیں بھیگ جاتی اور انعم کو اپنے کلیجے سے لگا لیتی۔

خلاف فطرت، انعم کی تعلیمی زندگی میں نکھار پیدا ہوتا گیا۔ اپنے آپ پر اس کا اعتماد بڑھتا گیا۔ وہ محسوس کرنے لگی کہ اللہ پاک کی عنایات کی بارش اُس پر مسلسل برس رہی ہے۔ جب وہ کسی سے کوئی صلاحیت واپس لیتا ہے تو اُس کو کئی اور صلاحیتیں سے نواز دیتا ہے۔ طاقت کا سرچشمہ اُس کے اندر سے اُبلنے لگتا ہے۔ چیزوں پر انعم کے ہاتھوں کی گرفت اگرچہ کمزور تھی لیکن ذہن کی گرفت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ اُس کی یادداشت بہت اچھی ہو گئی تھی۔ ایک عبارت ایک بار پڑھتی تو وہ اُس کے ذہن پر نقش ہو جاتی۔ عبارت دوبارہ پڑھ کر کنفرم کرتی تو وہ اُس کو ازبر ہو چکی ہوتی۔ لوگوں کا لمس اس کو یاد رہ جاتا اور لوگوں کے لہجے اس کے دماغ کے نہاں خانوں میں قید ہو جاتے۔ اس حادثہ نے اس کو اتنی چھوٹی عمر وہ کچھ سکھا دیا تھا جو بڑی عمر والے زندگی بھر کی ریاضت سے بھی نہیں سیکھ پاتے۔ اس نے حالات سے کمر و مائز

کر لیا تھا۔ وہ اس حقیقت کو سمجھ گئی تھی کہ زندگی کا اصل حسن اِس میں نہیں کہ جو نہیں ملا اُس کو یاد کیا جائے بلکہ زندگی تو یہ ہے کہ جو بچ گیا ہے --- جو آپ کے پاس ہے اُس کو بہترین طریقے سے کیسے استعمال کیا جائے - - - - انسان اپنا سو فیصد کیسے دے!!'' جب انعم کی ماں سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتی --- ہر لمحہ مدد کرنے کے لیے تیار ہوتی - - - نہ تھکان - - - - نہ اکتاہٹ --- تو اُس کو ماں کی عظمت کی سمجھ آتی - - - - اب اُسے سمجھ آتی کہ آخر ساری ہی تعریفیں اُس رب العالمین کی ہی کیوں ہیں۔

انعم کی میڈیکل کی تعلیم مکمل ہوگئی۔ اُس نے destinction کے ساتھ اپنی ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی۔ وہ طالب علم جو اُس پر ترس کھاتے تھے اب اُس سے دوستی میں فخر محسوس کرنے لگے۔ ایم بی بی ایس کی ڈگری کے مکمل ہونے کے بعد اُس کی ہاؤس جاب شروع ہوگئی۔ اس نے بہت محنت سے اپنا ہاؤس جاب کا وقت بھی اچھا اچھا گزار دیا۔ اُس کی محنت رنگ لائی۔ اللہ پاک کا کرم ہوا، سیٹیں آئیں اور مظفر آباد کے سب سے بڑے میڈیکل کالج میں اس کی سلیکشن ہوگئی۔ انعم نے وہاں، ماہر امراض دینی و دماغی نفسیات اپنی خدمات شروع کر دیں۔ اس نے دو سال وہاں بہت محنت کی اور خوب نام کمایا۔ اس نے وہاں نوٹ کیا کہ مریض اس سے بڑے انسپائر ہوتے۔ وہ اپنی مصیبتوں کو ڈاکٹر کی مصیبتوں کے سامنے بونا ہوتا ہوئے دیکھتے۔ انعم کو لگتا کہ اس کو زندگی کے لیے تازہ آکسیجن مل گئی ہے۔

علم کی پیاس بھی عجیب پیاس ہوتی ہے ----- آپ جتنا اس سے سیراب ہوتے جائیں یہ اور بڑھتی جاتی ہے۔ کچھ ہی عرصہ بعد اُس نے Psychiatry میں اعلیٰ تعلیم کی پڑھائی شروع کر دی۔ اس نے علمی محاذ پر ایک اور جنگ شروع کر دی تھی وہ یقین رکھتی تھی کہ دنیا کی ہر جنگ جنون، پیشین اور ایمان سے جیتی جا سکتی ہے۔ وہ چاہتی کہ اگر وہ جسمانی طور پر دوسروں پر depandant ہوگئی تو وہ معاشی طور پر زیادہ سے زیادہ indepandant ہو جائے۔ وہ اپنا معاشی پہلو مضبوط کرنا چاہتی تھی۔ ویسے بھی وہ disability اور inability کے فرق کو جانتی تھی۔ وہ disable تھی inable نہیں تھی۔ ایک مدت مقررہ کے بعد، کنگز کالج لندن میں ماسٹرز Psychiatry میں داخلے شروع ہو گئے۔ انعم نے داخلے کے لیے اپنی کوششیں

تیز کر دیں۔ الحمد للہ انعم نے کوشش کی اور اُس کو دنیا کی ایک بہترین میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔ انعم خوش قسمت تھی کو اس تعلیمی ورثہ کو استعمال کرنے کا موقع مل گیا۔اس نے ان کالج کے تعلیمی ورثے کی قدر کی اور خوب محنت کی۔

وہاں ایک آیا جی کا انتظام بھی ہو گیا جو خدمت کے لیے ہر وقت تیار رہتی تھی۔ اُسے کام کرنا آ گیا تھا۔ سٹڈی کرنا، حقائق اکٹھے کرنے ---- ڈیٹا کولیکشن--- اور اُن کا تجزیہ کرنا اور ان سے نتائج اخذ کرنا اُسے آ گیا تھا۔ اُس کے میڈیکل کالج نے، اس کے سٹاف نے اور اس کے کلاس فیلوز نے اُس کا بھرپور ساتھ دیا۔ انعم کی خدمت کر کے وہ اپنے انسان ہونے کا ثبوت دیتے تھے۔ انعم نے اپنے کالج سے بہت کچھ سیکھا۔ وہ جب کبھی بوریت یا اکتاہٹ کا شکار ہوتی تو ناول پڑھتی، "پاسکل" کے کردار سے انجوائے کرتی ۔جب اس کو inspiration کی ضرورت ہوتی تو وہ Hellen Keller کو پڑھتی۔ اپنی ویل چیئر پر وہ پہاڑوں کی چوٹیوں کی سیر کو نکل جاتی اور دنیا کو explore کرنے کی کوشش کرتی۔ سیر اس کا شوق بھی تھا اور عشق بھی۔ اس کا خیال تھا کہ بندہ کسی جسمانی معذوری سے معذور نہیں ہوتا بلکہ بیمار سوچ اُسے اپاہج بنا دیتی ہے۔ آخر یہ سفر ختم ہوا۔ اُس نے ماسٹرز میں بھی ٹاپ کر کے ایک تاریخ رقم کی۔

جس دن Degree Awarding Ceremony کا انعقاد ہوا، وہ دن انعم کی تکمیل مقصد کا دن تھا۔ ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں جب وہ کامیابی کے چبوترے پر --- اگرچہ وہ ویل چیئر پر تھی--- اسے لگا کہ وہ کسی کوہ گراں کے اوپر کھڑی ہے--- اسے اپنے آپ پر--- اپنی ماں پر--- باپ پر--- اساتذہ پر--- ساتھیوں پر--- اُس رب پر جس نے اُسے کبھی اکیلا نہیں چھوڑا تھا، فخر محسوس ہو رہا تھا---- وہ اپنے رب کا شکریہ ادا کرنا چاہ رہی تھی--- وہ جھکنا چاہ رہی تھی--- اس کی گردن خم نہ ہو سکی--- نہ سہی--- اُس کی روح جھک گئی---- وہ سوچنے لگی --- صرف جسم سے کیا ہوتا ہے --- انسان صرف جسم تھوڑا ہے--- روح بھی تو ہے۔ اس کے آنسو زمین پر گر کر--- شکریہ ادا کر رہے تھے۔ ایم۔ اے کی ڈگری اُس کے ہاتھ میں تھی۔ اُس کے اساتذہ اس کے گرد خوش ہو رہے تھے--- اُس کے ساتھی طالب علم، گاؤن پہنے اپنی خصوصی ٹوپیاں ہوا میں اچھال کر ہلہ گلہ کر رہے تھے۔ تصویریں بنائی جا رہی تھیں اور اِن آنسوؤں میں انعم مسکرا رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

زن زندگی

سینی ٹوریم کے وحشت زدہ در و دیوار روز زہرا کو یقین دلاتے کہ وہ بھی گارا مٹی ہے--یا اینٹ ہے، معمولی سی اینٹ--- اس سے زیادہ اسے اپنے وجود کی کوئی اوقات نہیں لگتی تھی- وہ چھت کی ٹائلیں گنتی رہتی اور اپنا وجود ڈھونڈتی رہتی وہیں باہر ریشم بھی گھومتی رہتی تھی- اکثر تو دائروں میں گھومتی پھر کمزوری کی وجہ سے گر پڑتی تو ہاتھ پاؤں مڑ جاتے، منہ سے جھاگ نکلنے لگتی- زہرا ڈر کر اپنے بستر کی طرف بھاگتی اور دبک کر اس میں گھس جاتی یہی اس کی واحد پناہ گاہ تھی- لیکن کبھی کبھی ریشم گم صم سی اس کے پاس آ کر لیٹ جاتی اور زہرا کے کان میں سرگوشیاں کرتی-

"دنیا گول ہے، تمہیں پتا ہے ناں؟ بالکل گول"

زہرا سر جھکا کر کہتی" ہاں یار--- اور یہ زندگی گول مال، ہیرا پھیری ...... سراسر دھوکہ" زہرا دکھ سے بھری ہنسنے لگتی- ہنستے ہنستے اس کی آنکھیں چھلک پڑتیں- تو دونوں رونے لگتیں-

زہرا گال صاف کرتے ہوئے اس کی طرف منہ کر کے کہنے لگی

"جب کوئی" اپنا" محبت کی پاسداری نہیں کرتا، قدر نہیں کرتا- آپ کا ساتھ نہیں دیتا، انتظار کرنے کا یا لوٹ آنے کا بھی نہیں کہتا تو دل سے اتر جاتا ہے- مطلب---- اس نے ثابت کیا کہ آپ کا وجود اس کے لیے بے معنی تھا- تبھی تو وہ آپ کے لیے لڑ نہیں سکتا- لیکن سنا تھا کہ آپ کا وجود آپ کے لیے اور آپ کے اپنوں کے لیے بہت قیمتی ہوتا ہے- یہاں تو ایسا بھی نہیں، جب اپنے اپنے نہ رہیں- اور محبوب محبتوں کی لاش سے گزر کر ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے تو اس کی سزا ہے اسے غیر کر دو--- خود کو بھی اکیلا

ثمینہ سید

چھوڑ دو--- سزا دو اپنے آپ کو بھی ایسے بندے سے محبت کیوں کی؟..... پہلی تو خود سوچ یہ کام آسان تھوڑی ہے سانسوں میں تحلیل اور روح میں گھلے ہوئے "اپنے" کی جدائی---- جدائی تو زہر ہے۔"

زہرا بولتی جا رہی تھی۔ وہ اکثر ایسے ہی بولتی تھی بے تکان --- فلسفے سے بھری باتیں۔ کسی کے جواب کی اسے طلب تھی نہ توقع۔ آج ریشم سراپا سوال بن گئی

"زہرا مجھے یہ تو سمجھ آتی ہے کہ بابر تمہارا منگیتر تھا، تم دونوں کی شادی طے تھی پھر وہ گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ جب اسے یہ پتہ چلا کہ تم ذہنی اور جسمانی طور پر بیمار ہو لیکن تم کہتی ہو کہ تم نے اسے دل سے اتار دیا، اس کا کیا مطلب ہے کیا تم نے اسے چھوڑا؟ اگر تم نے چھوڑا تو پھر اتنا واویلا کیوں، رونا دھونا کیوں؟"

زہرا سیدھی ہو بیٹھی اور ریشم کے پیلے زرد ہاتھ اپنے نحیف ہاتھوں میں لے کر کہنے لگی۔

"ریشم میری جان کیا فرق پڑتا ہے میں نے اسے چھوڑا یا اس نے مجھے چھوڑا--- حالات ایسے ہو جاتے ہیں، زندگی اس نہج پہ آجاتی ہے کہ ---دل میں جگہ ہی نہیں رہتی، راستے الگ ہو جاتے ہیں۔" زہرا بول رہی تھی ریشم ایک ٹک اس کا زرد چہرہ مزید زرد ہوتے دیکھ رہی تھی۔

"میرے تو امی ابا مر گئے تھے پہلے ابا گزرے پھر ایک سال کے وقفے سے امی، میں بہت لاڈلی تھی--- بگڑی ہوئی" ریشم تلخی سے ہنسی۔

"رشتے داروں نے مجھے سنبھالنے کی کوشش کی ہر کوئی چاہتا تھا میں اسکے گھر کل وقتی نوکرانی بن جاؤں، پر زہرا یہ جو ماں باپ کا لاڈ ہوتا ہے ناں یہ بھی کہیں کا نہیں چھوڑتا--- میں نے کوئی کام نہیں کیا، کسی کی چاکری نہیں کی۔ کئی پہر بھوکی رہتی۔ بھاں بھاں کر کے روتی پھر مجھے یہ دورے پڑنے لگے۔ چاچے نے میرا گھر بار بیچ دیا اور کہتا ہے سارا پیسہ میرے علاج پر لگ گیا--- میرے کپڑے شپڑے باندھے اور اپنے کسی جاننے والے کے ذریعے مجھے یہاں پھینک گیا۔ کہ میں مرگی کی مریض ہوں، سب کو مجھ سے جان کا خطرہ ہے۔ دورہ تو کسی وقت بھی پڑ سکتا ہے ناں جانی----

"وہ روتے روتے پھر بولی

"ماں کے ہاتھ کے بنے پراٹھوں کی خوشبو نہیں جاتی نتھنوں سے، روئی کا نوالہ آج بھی--- دو سال گزرنے کے بعد بھی حلق سے نہیں اترتا، بس زہر مار کرتی ہوں--- جب یہ پاپی پیٹ چیختا ہے۔"

آنسو ریشم کے چہرے کو بھگو رہے تھے۔ وہ صاف کرتی پھر بہنے لگتے، زہرا نے اسے

گلے لگالیا۔

وہ دونوں پچھلے دس گیارہ ماہ سے اس سینی ٹوریم میں تھیں - دور دراز ویران سی جگہ تھی۔ ہسپتال کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ دیواریں خستہ حال، پانی کے نل خراب، فریج بند، ٹی وی دیواروں پر سجے ہوئے لیکن یہاں رہنے والوں کے دلوں جیسے اجڑے ہوئے تھے۔ تقریباً سارے ہی مریض لاوارث بنے ہی رہے تھے۔ یہ سینی ٹوریم اب صرف ٹی بی کے لیے نہیں تھا۔ جب سے ٹی بی کا علاج کچھ آسان ہوا تھا یہاں دوسرے مہلک امراض والے مریض بھی رکھے جارہے تھے۔ کہنے کو کھلی فضا مریض کے لیے صحت افزا تھی اس لیے انہیں لایا جاتا تھا لیکن یہاں کچھ بھی صحت افزا نہیں تھا۔۔ کھانا، پینا، علاج اور نہ ہی رویے۔ جن مریضوں کے پیچھے کوئی بھی نہیں آتا تھا ان سے کئی طرح کے کام بھی کروائے جاتے۔ زہرا نے دسویں پاس کی تھی اس لیے اس کی ذمہ داری تھی کہ وہ سب خواتین کو پڑھائے گی۔ وہ بھی اس میں خوش رہنے لگی۔ یہ عزت اسے اس چار دیواری سے باہر تو ملی بھی نہیں تھی۔ اسے اپنے ڈرے سہمے امی ابا اکثر یاد آتے وہ منصوبے بناتی رہتی کہ کسی طرح سے ان کے دل سے پیروں کا ڈر نکال کے ان کے سینے میں سکون کی سانس بھر دے گی۔ لیکن یہ ناممکن ہی نظر آتا۔ پہلے ہی وہ بغاوت کرنے کی سزا بھگت رہی تھی۔

ریشم کے روز روز پوچھنے پر ایک دن وہ مان ہی گئی کہ اسے اپنے غم میں شریک کرلے۔

”ریشم میری کہانی بہت عجیب ہے تو دل پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ --- یقین نہیں آئے گا تجھے آج بھی ایسی اندھی عقیدت میں لتھڑے ہوئے لوگ ہیں۔“

”چل چل بتا۔ میرے تجسس کو ہوا نہ دے“ ریشم اس کے ساتھ لگ کے بیٹھ گئی یہ ایک طرح کا سہارا تھا جو وہ دونوں ایک دوسرے کو دیتی تھیں۔

میرے چھوٹے سے گاؤں میں ایک بڑا سا گھر ہے ”پیر خانہ“ بس اسی گھر میں انسان بستے ہیں - - - باقی ہم سب تو کیڑے مکوڑے، کاکروچ، کنکھجورے ہیں۔ میں بچپن سے ہی کچھ اور طرح کی تھی ضدی، ہٹ دھرم۔ وہ ہی بہنیں ہیں ہم۔ بجو کو شروع سے شادی کا شوق تھا۔ گڑیاں، پٹولے بناتی، ان کی شادیاں بھی رچاتی۔ ہم سب مہمان بن کے خوب کھاتے پیتے۔ وقت اچھا تھا ریشم -- پر مختصر تھا۔ اڑ گیا --- مجھے میری خواہش پر ابے نے پڑھنے دیا، کوئی بھی کچھ کہتا وہ لڑنے مرنے پر اتر آتا۔

”زہرا سانس لینے کو رکی تو ریشم نے آنکھیں

دوپٹے سے پونچھیں

''یار یہ ابے کتنے اچھے ہوتے ہیں، یہ مر کیوں جاتے ہیں؟''

''کبھی کبھی جیتے جی بھی مرجاتے ہیں بنو۔ جیسے میرے امی ابا نے کیا۔ دیکھ میرا حال۔۔۔ کیسی لاوارث ہوں۔''

زہرا نے سینے پہ ہاتھ رکھ کے کہا تو ریشم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

پھر اس کی ناک دبا کر شرارت سے بولی

''کوئی کانڈ تو تو نے بھی کیا ہوگا۔ بولتی جا اب رکنا نہیں بس۔۔۔ مجھے بتا اپنے کرتوت اور سچ بتانا۔ ورنہ''

''ریشم کچھ نہیں کیا میں نے۔۔۔ جب بجو کی شادی ہونے والی تھی تب ہی سب کچھ بدلنے لگا، کچھ عجیب سا ہوا۔۔۔ سمجھ میں نہ آنے والا۔ میں نویں کا پرچہ دے کے آئی تو اماں بجو کو لال جوڑا پہنا کے سجا رہی تھی، پھر اس کے کانوں میں کچھ کہتی رہی کچھ دیر بعد اسے لے کر بڑی حویلی چلی گئی ''پیر خانہ'' ابا سر جھکائے چپ بیٹھا تھا۔ میں پیروں میں بیٹھ گئی، ٹانگیں دبانے لگی تو جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔۔ میرا ماتھا چوما اور بولا، نہ دھیے نہ میرے برابر بیٹھ۔۔ ادھر بیٹھ، میں بیٹھ گئی اور غور سے اس کا پیلا پڑتا چہرہ دیکھنے لگی۔ کچھ منہ میں پڑھ بھی رہا تھا۔ میں نے پوچھا بجو کو اماں کہاں لے گئی؟ شادی میں تو ابھی دن ہیں پھر لال جوڑا۔۔؟''

زہرا سانس لینے کے لیے رکی، ریشم کے ہاتھوں میں اس کے ہاتھ جلنے لگے شاید بخار پھر سے چڑھنے لگا۔ ریشم چپ رہی وہ دو گھونٹ پانی پی کے خود ہی دوبارہ شروع ہوگئی۔

''اماں جب بجو کو واپس لائی تو بڑی خوش تھی اس نے ابا کو کچھ بتایا وہ بھی شکر کے کلمے پڑھنے لگا۔۔ پر ریشم میری بجو کی حالت ایسی تھی جیسے اسے کسی جانور نے نوچ ڈالا ہو۔ اس کے کپڑوں پر جگہ جگہ خون کے دھبے تھے اور ہاتھوں پر، منہ پر خراشیں۔۔۔ اللہ جانے کیا ہوا تھا۔ میں نے بہت پوچھا کسی نے بھی کچھ نہ بتایا اور پھر کچھ دنوں میں بجو بیاہ کے چلی گئی۔۔ اگلے ہی مہینے میری سہیلی فاطمہ کے ساتھ بھی یہ سب ہوا۔ لیکن مجھے کوئی کچھ نہیں بتا رہا تھا تب تک جب تک میری باری نہیں آ گئی کسی نے کچھ نہ بتایا۔ میں بابر کی بچپن کی منگ تھی اب تو ہمارے دل بھی ایک دوسرے کے نام پر ناچ اٹھتے تھے۔ وہ شہر میں پڑھ رہا تھا اور میں اپنے پنڈ کے ساتھ والے قصبے کے ہائی سکول میں، پانچ سال بڑا تھا مجھ سے پر لگتا نہیں۔۔ تو دیکھے گی تو تجھے بھی نہیں لگے گا۔ بڑا سوہنا جوان نکلا ہے۔''

زہرا کی آنکھیں محبت کی لو سے چمکنے لگیں،

زرد گال مہکنے لگے۔ ہانپتی ہوئی بولی
'' گھر میں شادی کی تیاری چل رہی تھی، ڈھولک کی تھاپ پہ دل ناچتا تھا تسے ----- پر اماں نے پھر وہی کیا-- مجھے تیار ہونے کو کہا، بولی'' لال جوڑا پہن لے--- حویلی چلنا ہے اور سن سوال جواب نہ کرنا-- پڑھائی لکھائی نے تیری مت ماردی ہے۔ جو رسمیں ہیں وہ پوری کرنی ہیں بس۔ '' میں حیران پریشان اماں کے قریب آ گئی---- کیا رسمیں حویلی جا کے پوری ہوتی ہیں بتا تو سہی اماں؟''
'' پھر بتایا اماں نے؟'' ریشم بے صبری ہو رہی تھی۔
''نہیں زبردستی لال جوڑا پہنایا --- گندا مندا سرخی پاؤڈر بھی خود ہی تھپنے لگی، گھورتی جا رہی تھی کہ میں چپ رہوں --- بس اتنا بولی،
''بی بی صاب لڑکی کی پاکدامنی کی گواہی دیں تو ہی لڑکی کی شادی ہوتی ہے----- میرا تو دل پھٹنے لگا آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں'' اماں بی بی صاب کیسے؟'' سائنس پڑھ چکی تھی میں---- بہت کچھ جان بھی چکی تھی۔ کیسے سوال نہ کرتی۔ میں نے شور مچا دیا۔ کہ پہلے مجھے بتاؤ بی بی صاب کیسے------؟'' سب میرے آگے ہاتھ جوڑنے لگے۔ بچی صدیوں کی روایت ہے--- ان کا بچہ سائیں لوگ ہے----- اور وہ--- دعا دیتا ہے ------- '' میری آنکھوں کے آگے بجو کے، فاطمہ کے، حمیدہ کے نوچے ہوئے چہرے اور خون آلود کپڑے گھومنے لگے، میں سر پکڑ کے بیٹھ گئی-- چیخنے لگی، ہاتھ پیر مارنے لگی، سوچ لیا نہیں جاؤنگی تو بس ------ نہیں گئی۔''
ریشم کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا
''اوررررر بابر--- اس نے کیا کہا؟''
'' سارے گاؤں میں بات پھیل گئی۔ کہ زہرا پڑھنے جاتی تھی شہر، وہاں کسی کے ساتھ منہ کالا کر آئی ہے، کنواری نہیں رہی اب پاگل بننے کا ڈرامہ کر رہی ہے۔ میں نے بہت کہا مجھے بابر سے ملنے دو ---- پر اپنے ہی میرے دشمن بن گئے --- اماں نے مجھے بہت مارا--- ہر آتا جاتا تھوتھو کرتا اور میں نے سنا کہ بابر واپس شہر چلا گیا، مجھے بتائے بغیر--- ہمیشہ کے لیے، یہ بھی سنا کے وہاں سے باہر چلا جائے گا۔ باہر کے ملک''
'' پر تجھے ملنا تو سہی، تجھ سے حقیقت تو جاننے کی کوشش کرتا۔ پڑھا لکھا تھا آخر، سنی سنائی پر یقین کیسے کر لیا ظالم نے۔''
''ریشم وہاں کوئی کسی کی نہیں سنتا--- مجھے ٹی بی ہو گئی--- تو یہاں پھینک گئے، رب گواہ ہے میں پاک دامن ہوں--- مجھے تو کسی کے خیال تک نے نہیں چھوا --- '' زہرا بے بسی سے اپنی صفائی دے رہی تھی کوئی تو تھا جس نے اس کی بات سنی۔ زہرا کو زور کی الٹی آئی

فرش پر خون پھیلتا چلا گیا۔

''ہائے میں مر جاواں— دنیا کہاں پہنچ گئی، اور تیرے پنڈ میں ایسی رسمیں۔ آج بھی ایسی اندھی عقیدتیں ----- اب تیرا کیا ہوگا— زارو میری جان'' ریشم اسے سنبھالتے سنبھالتے بے حال ہونے لگی۔

''اماں اور ابے میں لوگوں کی نفرت سہنے کی ہمت نہیں ہے اور نہ ہی انہیں مجھ پہ بھروسہ ہے— کہتے ہیں تو سچی ہے تو حویلی چل— آزمائش سے گزر -----''

زہرا کا رواں رواں کانپ رہا تھا— بخار بھی شدت پکڑنے لگا تو ریشم نے اٹھتے ہوئے ہاتھ جھاڑے۔

''میری سن بات--- جیتے جی مرنا نہیں ہے لاڈو— تو سچی ہے تجھے یقین ہے ناں، مجھے بھی تیرا یقین ہے۔''

''اور مجھے بھی ---- مجھے بھی تیرا یقین ہے میری جان زہرا--- میں حالات ٹھیک کر رہا تھا، میں نے آنا ہی تھا لیکن یہی چاہتا تھا کہ تو اس گاؤں اور ان لوگوں سے نکل جاؤ مجھے تیری طاقت اور پاکدامنی دونوں پر بھروسا ہے۔ میں نے آنا ہی تھا تیرے پاس، اب بھی بڑی مشکل سے تیرا پتہ لگایا۔''

یہ بابر تھا— زہرا کے قدموں کے قریب بیٹھ گیا۔ دونوں لڑکیاں حیرت زدہ تھیں۔

''یہ میرا بابر ہے ریشم'' زہرا نے محبت سے لرزتی آواز میں ریشم کو بتایا تو وہ دل سے ہنسی۔

''تیرے بتانے سے پہلے ہی میں جان گئی ہوں --- کان پک گئے اس بندے کے حسن اور جوانی کے قصے سنتے سنتے۔ شکر ہے یہ آ گیا۔''

''پر بابر ------ اب تو وقت ہی نہیں رہا— میں تو مرنے والی ہوں ----- تم نے انتظار کا کہا ہی نہیں تھا— مان کا کوئی سرا میرے ہاتھ میں تھا ہی نہیں۔'' وہ کھانسنے لگی

''میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا، میری محبت —''

''محبت بروقت اظہار مانگتی ہے بابر— سنبھالا اور بھرے جگ میں مان دینا ضروری ہوتا ہے سوہنیا، اب تو چڑیاں چگ گئیں کھیت ---- '' زہرا کی بولنے اور کھانسنے سے سانس اکھڑنے لگی۔ ریشم اور بابر دونوں اسے سنبھالنے لگے۔ ڈاکٹر بھی آ گیا— زہرا کی حالت بگڑ رہی تھی۔ بابر کے ہاتھ کو اپنے بے جان ہوتے ہاتھ میں لے کر بولی'' میں کسی کے ساتھ بری نہیں تھی— تمہارے سوا کوئی تھا— ہی نہیں— لیکن تم، جب تم میرا آسرا نہیں بنے ناں تو دل سے اتر گئے ----اب نہیں''

خون کی الٹی پھر زور سے آئی— اور بابر کی گود میں اس کا وجود سرد پڑ گیا۔ زندگی موت کے آنچل میں آسودگی ڈھونڈنے چل پڑی۔

☆☆☆☆☆

جیب تراش [انشائیہ]

جب کوئی پیٹو شخص اپنی توند میں اشیاء خورد و نوش کے انبار لگا لیتا ہے تو اُس کا چہرہ لمحے بھر کے لیے دمک اُٹھتا ہے لیکن جب ان اشیاء کو جگہ کی تنگی کا احساس ہونے لگتا ہے تو اس پیٹو شخص کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے نعرے بازی شروع کر دیتی ہیں کہ ہمیں یہاں سے رہائی دلائی جائے۔ یہاں ہمارا دم گھٹتا ہے۔ اُن کی یہ نعرے بازی سُن کر اس کے چہرے کی ساری چمک دمک کافور ہو جاتی ہے۔ لیکن ان کا احتجاج اُس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک وہ کال کوٹھڑی سے رہائی نہیں پا لیتیں۔ لیکن ہمیں تو خود کو خوش قسمت سمجھنا چاہیے کیونکہ جب بھی ہم اپنی جائز و ناجائز خواہشات کی تکمیل کے لیے اپنی جیبوں کو ایک پیٹو انسان کی طرح اوور لوڈ کر کے نکلتے ہیں تو کوئی نہ کوئی جیب تراش ہمارے تعاقب میں نکل کھڑا ہوتا ہے اور جونہی اُسے موقع ملتا ہے وہ چپکے سے ہمارے قریب آ جاتا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہماری جیب کی کال کوٹھڑی میں بند سکّے تنگیِ جاں کی شکایت کرتے ہوئے احتجاج کی راہ اختیار کریں وہ خاموشی سے ان کی رہائی کا بندوبست کر دیتا ہے اور پھر آناً فاناً غائب ہو جاتا ہے۔ ویسے سوچنے کی بات ہے کہ کسی کو حبسِ بے جا میں رکھا ہی کیوں جائے جبکہ یہ قانون کی نظروں میں بہت بڑا جُرم ہے۔ لیکن سُنا ہے کہ طاقتور قانون کو اپنا غلام سمجھتا ہے اور کمزور اپنا آقا۔ جیب تراش ایک ایسی شخصیت ہے جو قانون کو بیک وقت اپنا غلام بھی تصوّر کرتی ہے اور اپنا آقا بھی۔ لیکن میرے خیال کے مطابق موجودہ دور کے جیب تراشوں کو قانون کے ساتھ اتنی پیچیدگیاں بڑھانے کی چنداں ضرورت نہیں رہی کیونکہ آج کے سکّہ سازوں نے جیب کتروں سے ساز باز کر کے سونے چاندی کو کاغذ میں تبدیل کر کے ان کے لیے آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ اگلے وقتوں میں جب کوئی جیب کاٹتا تھا تو سونے چاندی کے سکّوں کی چیخ پکار شروع ہو جاتی ہے اور جیب تراش بے نیلِ مرام لوٹ جاتا تھا لیکن آج کے دور میں جیب تراشتے وقت کوئی شور و غوغا نہیں ہوتا۔ کاغذ ہیں کہ چُپ کی چادر اوڑھ کر خود کو خاموشی سے جیب تراش کے حوالے کر

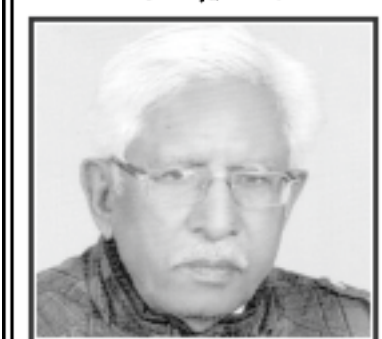

حنیف باوا

دیتے ہیں۔ ویسے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کاغذ کے زمانے سے سونے چاندی کا زمانہ کہیں بہتر تھا جس طرح سونے چاندی کے سکے اپنے کھرے کھوٹے کا اعلان برملا کر دیا کرتے تھے، بعینہٖ اُس وقت کے معاشرے کا انسان اپنے سے اُٹھتی ہوئی کسی بھی کھری یا کھوٹی آواز کو نہیں دباتا تھا لیکن جب سے کاغذ کا زمانہ آیا ہے انسان اپنے اندر سے اُٹھتی ہوئی کسی بھی آواز کو خاطر میں نہیں لاتا۔ بس دن رات اپنی جیب کی پرورش میں لگا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی جیب تراش اُس کی جیب کو اُس کے وجود سے الگ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ خود کو تحت الثریٰ میں اُترتا محسوس کرتا ہے۔ انسان کی اسی کمزوری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کسی سیانے نے کہا ہے کہ جیب کو انسانی لباس سے کاٹ پھینکا جائے تو بہتر ہوگا۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ سیانے کی اس بات پر عمل کرنے سے جیب تراش کے وجود کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ جیب تراش کو اس کائنات سے منہا کر دینے سے ممکن ہے ہماری موجودہ تہذیب ہی کا بستر گول ہو جائے اور ہم پھر سے پتھر کے زمانے میں لوٹ جائیں۔ لہٰذا ہمارے لیے یہی بہتر ہوگا کہ جیب تراش کے وجود کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی جیبوں کو متوازن رکھنے کی سعی کریں ایسا کرنے سے سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی۔

بیرونی دُنیا کے جیب تراش کی طرح ہمارے اندر بھی ایک ایسا جیب تراش چھپا بیٹھا ہے جو چالاک بھی ہے اور دیدہ دلیر بھی۔ وہ ہمیشہ ہمیں اپنے سر سے بوجھ اُتار دینے کی تلقین کرتا رہتا ہے۔ ہم نے جب بھی اُسے حکم دینے کی کوشش کی ہے تو وہ جھٹ جراحی کا سامان لے کر ہمارے عقب میں آ گیا ہے اور ہماری کھرے سکوں سے بھری جیب کاٹ کر چلتا بنا ہے۔ اس جیب تراش کا یہ اقدام بظاہر ہمارے لیے تکلیف دہ ہے لیکن ہماری ہر دم بڑھتی اور پھیلتی ہوئی خواہشات کی قطع و برید کرنے والے کی نیت پر شک بھی تو نہیں کیا جا سکتا۔

جیب تراشنا ایک فن سہی مگر جیب تراشوانا اس سے بھی بڑا فن ہے۔ اس کے لیے اعلیٰ ظرفی بھی درکار ہے اور درویشانہ مسلک بھی! جب کسی کی جیب کٹتی ہے تو وہ صبر شکر کر لیتا ہے یا پھر رونے دھونے لگتا ہے تو اس کی یہ کارروائی ایک عام سا انسانی رویّہ ہی کہلائے گی مگر جب وہ اپنی جیب کٹتے دیکھتا ہے اور ایک معنی خیز تبسم کے ساتھ جیب کترے کی بے چارگی اور بے بسی کا نظارہ کرتا ہے تو وہ انسانیت کے اس مقام بلند پر خود کو پاتا ہے جس سے اونچا اور کوئی مقام نہیں ہے۔ غالب اپنی شاعری میں اسی بلند مقام پر کھڑا نظر آتا ہے جب وہ ایک تبسم زیرِ لب کے ساتھ برملا کہہ اُٹھتا ہے:

رہا کھٹکا نہ چوری کا دُعا دیتا ہوں رہزن کو

☆☆☆☆☆

خوف کیسا (مائیکرو ف)

ایک نئے تجربے کے لیے تیار ہونا کتنا مشکل کام ہوتا ہے جیسے نیا جنم لینا---
لیکن آج اس کے اندر خوشی یوں موجزن تھی جیسے سمندر چودھویں کی رات ٹھاٹھیں مارتا ہے۔

وہ خود حیران تھا کہ وہ اپنے اصل جسم اور انھیں اعضا کے ساتھ کھڑا تھا جن پر اس کا پیدائشی حق 1963 سے قائم تھا۔

اب وہ نئی دنیا کا باسی تھا۔ اس کے جسم کی طاقت اور ذہنی کارکردگی کئی گنا بڑھ چکی تھی۔ ایک کڑے، پیچیدہ اور تکلیف دہ عمل سے گزر کر ایک مہین سی چپ اس کے جسم کا حصہ تھی جسے کوئی بیرونی مدد درکار نہ تھی۔ وہ بدن کے قدرتی کیمیائی عوامل کے ساتھ گھل مل کر جزو بدن بن گئی تھی۔

جب اسے بھرپور تازگی کا یقین ہوگیا تو مستقبل کی لہروں پر جھولنے لگا۔

مستقبل، ماضی سے کب جدا ہوتا ہے۔ ایک تیز جھکولا اسے ماضی میں لے گیا۔

اسے یاد آیا نوجوانی میں گاؤں سے شہر منتقل ہونے کا فیصلہ کتنا کٹھن تھا۔ وہ تب بھی بیمار ماں، اداس بہن بھائیوں اور دوستوں کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے ان پہاڑوں، درختوں اور پرندوں سے بھی پیار تھا جن کے ساتھ اس کا سنگ زندگی کی پہلی ساعتوں سے قائم رہا تھا۔

تب محبت اور ان دیکھے جہان کا خوف رکاوٹ بن رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ شہر جانا اس کے لیے نیا جنم ہوگا اور اگلے جنم میں داخلے کے لیے اسے مرنا تو پڑے گا۔

--- پھر وقت نے پلٹا کھایا شہر کے رنگ چڑھے، مزدور سے کامیاب بزنس مین تک کا سفر --- شادی --- بچے ---

اس کی شادی کی راہ، ای میل کے رابطے سے ہموار ہوئی تھی۔ وہ اس بات پر خوش تھا کہ یہ مرحلہ روایتی کے بجائے جدید انداز سے طے ہوا۔

اس کے سامنے زندگی کا ہر دور اور اس سے جڑا ہر ڈر کسی فلم کی طرح منظر بدل رہا تھا۔ وہ

سید ماجد شاہ

دیکھ رہا تھا نئی چیز کے استعمال کی کپکپاہٹ--- پھر اس نئی دنیا کا کولمبس بننا--- پھر اس کا عادی ہو کر نئے دوست، نیا ماحول، نیا جذبہ ---

یہ سوچتے ہوئے ذہن میں چلنے والی فلم میں ٹیلی فون، ٹی وی، اینٹینے، وی سی آر، کیبل، موبائل وغیرہ کے مختلف ماڈلز کی تصویریں گھوم گئیں۔

اسے یاد آیا---

جب چیٹ جی پی ٹی--- کا آغاز ہوا تو اسے ایک ایسا سہارا مل گیا جو اس کی ذہانت کا متبادل تھا۔ اس ایپ پر صرف اس کے کاروبار کی ترقی اور آسائشوں کا دارومدار نہ تھا بلکہ دوسرے جیون ساتھی کی تلاش سے لے کر دوسری بیوی کی اولاد، ان کی صحت اور فیوچر تک اس ایپ کے ساتھ ہونے والی چیٹ پر منحصر تھا۔

تب بدلتی دنیا کے ساتھ بدلتا صحت مند، بے بی بومر، جینریشن ایلفا جیسا سوچتا تھا۔

لیکن وہ تھا تو بے بی بومر، اس لیے وسوسے کبھی کبھی اس قدر حاوی ہو جاتے کہ وہ پریشان ہو جاتا تھا۔ گو کہ وہ ہر ماحول میں ڈھل جانے میں پہل کرتا تھا لیکن وہ تھا تو اس نسل سے جسے سائنس سے زیادہ جسم کی طاقت پر بھروسا ہوتا تھا۔

وہ سوچتا، یہ ہے تو ایک ایپلیکیشن ہی نا---اگر کوئی مسئلہ ہو گیا یا کسی طرح اس ایپ تک رسائی ناممکن ہوئی تو کیا ہوگا؟

دشوار گزار پہاڑی گاؤں میں پلنے والا، جسم پر اضافی بوجھ سے اکتا جاتا ہے۔

اسے تو نظر کے چشمے، انگوٹھی، گھڑی، موبائل، لیپ ٹاپ تک سے بعض اوقات اکتاہٹ ہو جاتی تھی۔ وہ مشینوں کے استعمال میں تاک تھا لیکن اس نسل سے تھا جسے مشینوں سے زیادہ جسم کی طاقت پر بھروسا تھا۔

وہ آرٹیفشل انٹیلی جنس کو جسم کا حصہ بنا کر اس کی نمو جسم کے اعضا کی طرح کرنا چاہتا تھا۔

سو آج وہ کامیابی کی نئی منزل پر کھڑا ہے اس کی آنکھوں میں نئے ماحول اور نئے جہان سے تعارف کی چمک ہے لیکن اس کی آنکھوں میں پیچھے رہ جانے والوں کے لیے نمی نہیں ہے - ہاں ہمدردی ضرور ہے۔

☆☆☆☆☆

دھند

نومبر کی ایک خنک شام میں جب گاڑی کے شیشے پر آنکھوں کو اندھا کر دینے والی دُھند چھائی تھی اور انھی دھندلے شیشوں میں سے جب میں تیزی سے گزرتے درخت اور تیز رفتاری سے گزرتی ہوئی دھندلی گاڑیاں دیکھ رہا تھا تو وہ تب بھی میرے پاس ہی موجود تھی۔

میں جس گاڑی میں اس کے ہمراہ سفر کر رہا تھا اس میں ہر ملے جلے مزاج کے لوگ تھے۔ مجھے معصوم بچوں کے اپنی ماں کے ساتھ کھیلنے کی آوازوں کے ساتھ، ان دو عورتوں کی اپنے شوہروں کے شکوہ کرنے کی آواز، گاڑی کے انجن کی ہلکی لیکن کانوں میں لگتی آواز اور ساتھ اپنے دل کی دھڑکنوں کا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔ اس سب میں کچھ بھی غیر معمولی نہیں تھا۔

سب کچھ معمول کے مطابق ہو رہا تھا جس کے لوگ عادی تھے۔ حیران کر دینے والی بات اس ہجوم میں بیٹھی ایک غیر معمولی اور جاذب نظر لڑکی تھی جو ان سب سے الگ تھی۔ شاید وہ اس دنیا کی نہیں تھی جسے لوگ اتنی حیرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اسے اس دنیا اور اس کی سفاکیوں کا اندازہ نہیں تھا۔ لوگوں کے لیے وہ ایک ایسی مخلوق تھی جو اس دنیا کی تو بالکل نہیں ہو سکتی کیونکہ اس نے اپنے جذبات کی گہرائیوں اور سچائیوں سے ایک ایسے شخص کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا جو اس سے کہیں الگ تھا۔ ان دونوں کا لہجہ، پہناوا اور بول چال سب کچھ ایک دوسرے سے بالکل الگ تھا۔ لوگ اس بات کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے تھے کہ وہ لڑکی ایک ایسے شخص کا ہاتھ پکڑ کے بیٹھی ہو جو اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان لوگوں کا دماغ یہ تسلیم نہیں کرنا چاہتا کہ ایک کھارا پانی اور میٹھا پانی ایک ہی ندی میں بہہ سکتے ہیں۔ گاڑی میں لوگوں کا ایک خاموش پر مشتمل ہجوم تھا، جن کا ظاہر ساکت پر باطن ہمارے ملاپ پر جیسے ایک صدائے احتجاج بلند کر رہا ہو۔ شاید لوگ یہ سوچ رہے ہیں کہ پانی اور آگ کا ملاپ نہیں ہو سکتا اور یہ کہ کوئل اور عقاب کیونکر ایک دوسرے کے ہم نوا ہو سکتے ہیں۔

لوگ اپنی اپنی سوچ میں ہم دونوں کو الگ کر کے دنیا کے الگ الگ کونے میں پھینکنے کے ہزاروں حربے سوچ رہے تھے۔ کچھ لوگ اپنی انھی سوچوں کے جال میں پھنس چکے تھے اور کچھ لوگ اس ایک ہاتھ پر رشک کر رہے تھے جس کی گرفت میں اس ماہ جبین کا ہاتھ آ گیا تھا۔

لیکن ان بے ذوق اور کورے دل کے مالک لوگوں سے بے خبر وہ دو ہاتھ اس فکر میں لگے ہیں کہ اپنی گرفت کو اور کیسے مضبوط کیا جائے کہ یہ بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں، ایک دوسرے سے دور نہ ہوں ایک دوسرے سے اوجھل نہ ہوں اور یہی اس ہجوم کے لیے حیرانی کی بات تھی۔

اوس کی وجہ سے دُھندلے شیشوں میں سے دنیا تیزی سے گزرتی جا رہی تھی اور لوگوں کی سوچ اور کشمکش میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ موسم کی دھند سب لوگوں کے ذہنوں پر اتنی چھا چکی تھی کہ انھیں اس لڑکی کی پیشانی، گردن، کلائی اور دل پر لگے وہ گھاؤ دکھائی نہیں دے رہے جو اس شخص کی دین تھے جو دنیاوی ترجیحات کے مطابق اس کے ساتھ جچتا تھا اور نہ ہی ان سب کو میرا ساتھ اس لڑکی کے مرہم اور تریاق کے طور پر دکھائی دیتا تھا۔ اسی وجہ سے ہم دونوں سب کی نظروں اور سوچوں سے پس پشت ہو کر بس اس ہجوم میں انھی کی پروا کر رہے ہیں جو اپنے رب سے یہ دعا کر رہے ہیں کہ یہ ہاتھ آخری سانس تک ایک دوسرے کا لمس محسوس کریں۔

☆☆☆☆☆

مدثر حسین

کوئی بات نہیں

ارے سفیر کیسے ہو بھئی؟
جی انکل، الحمدللہ آپ کیسے ہیں؟
میں بھی ٹھیک ہوں، بیٹا شادی کا کیا ارادہ ہے؟
شادی کا تو ابھی میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔
جلدی جلدی کرلو، عمر ڈھل رہی ہے پھر اچھا رشتہ نہیں ملے گا۔
اچھا انکل!
چلو رشتہ ہی پکا کروالو، پلاٹ اپنے نام کرواؤ، فائل لے لو، قبضہ پھر ہو ہی جائے گا ہاہاہا!
جی انکل!
(رشتہ پکا ہونے کے بعد)
سفیر بیٹا، آپ کا رشتہ پکا ہوئے کتنا عرصہ ہوگیا ہے؟
آنٹی ایک سال۔
بیٹا اتنی دیر نہیں کرتے، منگنی جلدی کرلینی چاہیے۔
نہیں آنٹی ابھی میرا ذہن نہیں ہے۔
بس بیٹا، بات کو سمجھتے ہوتے ہیں۔ منگنی ہوجائے گی تو اس کے نام کے ساتھ آپ کا نام جڑ جائے گا۔
جی یہ تو ہے
کیونکہ بیٹا جس گھر میں بیری ہو لوگ وہاں پتھر تو مارتے ہی ہیں
جی آنٹی میں سمجھ رہا ہوں۔
(منگنی کے بعد)
سفیر بیٹا، آپ کی منگنی ہوئے کتنا عرصہ ہوگیا ہے
آنٹی ایک سال
بیٹا اتنی دیر نہیں کرتے، شادی جلدی کرلینی چاہیے۔
کیوں آنٹی، میں ابھی سٹینڈ ہونا چاہتا ہوں۔
بس بیٹا، بات کو سمجھتے ہوتے ہیں آگے سے سوال نہیں کرتے۔
جی بہتر آنٹی
(شادی کے بعد)
اور سفیر بیٹا، پھر خوش خبری کب سنا رہے ہو؟
جی آنٹی، یہ تو اللہ کے کام ہیں۔
کام تو اللہ کے ہی ہیں لیکن بیٹا بندے کا بھی کچھ کام ہوتا ہے۔
آنٹی جس روح نے دنیا میں آنا ہے وہ آکر رہتی ہے۔
جی یہ تو ہے، بس ہمیں شدت سے انتظار ہے۔
اچھا آنٹی!
(خوش خبری..... بیٹی ہوئی)
سفیر بیٹا، آپ کے یہاں اولاد ہوئی ہے؟
جی الحمدللہ!
ماشاءاللہ، بچہ ہے یا بچی؟
جی میری بیٹی ہوئی ہے۔
اچھا چلو کوئی نہیں ---- اللہ بیٹا بھی دے گا!

☆☆☆☆☆

عمار نعیمی

خود کفیل [مائیکرو فکشن]

سورج کول تار کی سڑک پر آگ کے تھپیڑے برسا رہا تھا، اور چکنے کول تار سے دھوئیں کے بھبکے اُٹھ رہے تھے --- اُس کی دھنسی ہوئی آنکھیں کوڑا کرکٹ کے ڈھیر کا طواف کر رہی تھیں--- کالے اور کھردرے ہاتھ بڑی تیزی سے گندگی کے ڈھیر کو کھرچ رہے تھے--- سیاہ جلد پر پسینے کے قطرے سورج کی تمازت سے چمک رہے تھے ----

دور شہر کے مشہور سٹیڈیم میں یوم آزادی کی تقریبات کی ابتدا ہو چکی تھی اور لاؤڈ سپیکر پر ایک نامور سیاسی رہنما کے الفاظ عوام کے کانوں میں رس گھول رہے تھے—

''بڑی کٹھنائیوں کے بعد ہم ایٹم بم بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں''

اُس کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں اچانک چمک پیدا ہوئی-- لوہے، تانبے اور پیتل کے کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے-- اُس نے پسینہ پونچھا اور چمکیلی سڑک کو پیروں کی ٹھوکر سے ترکرتا ہوا کباڑی کی دکان پر پہنچ--- پانچ روپے کا نوٹ حاصل کرتے ہوئے اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس نے بڑی کٹھنائیوں کے بعد ایٹم بم بنانے میں کامیابی حاصل کی ہو—

جب بازار سے دو روٹیاں خریدنے کے بعد واپس اپنی جگہ پر پہنچ گیا تو لاؤڈ سپیکر کی مانوس آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی—

''اب ہمارے دیش میں روٹی کا مسئلہ ہے نہ کپڑے کا اور نہ مکان کا- اب ہم خود کفیل ہیں''

اور وہ جھلسا دینے والی دھوپ سے بچنے کے لیے مین ہول میں گھس گیا—

☆☆☆☆☆

راجہ یوسف

ویلنٹائن ریورس [مائیکرو فکشن]

ارباز آج خوشی سے سرشار گھر لوٹا تھا- آج ویلنٹائن ڈے تھا- اس نے سارا وقت اپنی محبوبہ کے ساتھ گزارا تھا- وہ خوب بن ٹھن اور خود پر خوشبوئیں انڈیل کر گیا تھا- ارباز اور اس کی محبوبہ نے ایک دوسرے کو ویلنٹائن گفٹ بھی دیے تھے-

گھر پہنچے تو وہ ایک کام کے سلسلے میں اپنی بہن کے کمرے میں گیا- اس کی بہن کمرے میں نہیں تھی- وہ ڈریسنگ روم میں تھی- ایک میز پر اس کی بہن کی ڈائری کھلی پڑی تھی- ارباز نے غیر ارادی طور پر وہ ڈائری اٹھائی- اس پر ایک تحریر موجود تھی-

''آج مجھے میرے پرنس نے ویلنٹائن روز اور گفٹ میں ایک خوبصورت ڈریس لے کر دیا ہے- بالوں لگانے کے لیے ایک گجرا اور پرفیوم بھی دیا ہے- اس نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں یہ ڈریس پہن کر، بالوں میں گجرا لگا کر اسے اپنی ایک تصویر ارسال کروں- اب میں اپنے پرنس کی خواہش پوری کرنے جا رہی ہوں''

یہ تحریر ارباز کے لیے کسی بم سے کم نہیں تھی-

اس کے ہاتھوں سے ڈائری نیچے گر گئی تھی- اسی لمحے کمرے میں خوشبو اور قدموں کی چاپ ایک ساتھ آئی- ارباز نے دیکھا تو اسے اپنی بہن سجی سنوری، بالوں میں گجرا سجائے، ویلنٹائن والا ڈریس زیب تن کیے دکھائی دی-

ارباز پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنی بہن کو دیکھ رہا تھا- جبکہ بہن بھی پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنے بھائی اور اس کے قدموں میں پڑی اپنی ڈائری دیکھ رہی تھی-

☆☆☆☆☆

بابر امین ابر

غم

رات کی سیاہی گہری ہو رہی تھی، اور آسمان پر چھائے بادل چاند کی روشنی کو نگل رہے تھے۔ ہوا میں خزاں کی ٹھنڈک تھی، مگر اس کی آنکھوں میں موسم کا اثر نہیں تھا۔ اس کے کمرے کی کھڑکی کھلی تھی، اور باہر سے سرد ہوا کے جھونکے پردوں کو ہلکا سا جھنجھوڑ رہے تھے۔ وہ ایک پرانی لکڑی کی کرسی پر بیٹھی تھی، ہاتھ میں ایک تصویر تھامے۔ یہ تصویر اُس کی ماں کی تھی، جس کی مسکراہٹ میں سکون تھا مگر آنکھوں میں ایک چھپا ہوا درد۔

عائشہ کی زندگی کے غموں کی کہانی اُس دن سے شروع ہوئی تھی جب اُس کی ماں بیمار ہوئی۔ کینسر کی تشخیص نے جیسے گھر کی خوشیوں کو مات دے دی۔ ماں کی مسکراہٹ دن بہ دن مدھم ہو رہی تھی، اور عائشہ کے دل میں خوف گھر کرتا جا رہا تھا۔ اُس کے والد نے بہت کوشش کی، علاج کروانے کے لیے اپنی ہر ممکنہ جمع پونجی لگا دی، مگر قدرت کا فیصلہ اٹل تھا۔

ماں کے جانے کے بعد عائشہ کی زندگی جیسے ایک خلا میں بدل گئی۔ ہر طرف خاموشی، ہر کونا تنہائی سے بھر گیا۔ والد نے بھی اُس کا غم بانٹنے کی بہت کوشش کی، مگر وہ خود اندر سے ٹوٹ چکے تھے۔ عائشہ نے اپنی پڑھائی میں دل لگانے کی کوشش کی، لیکن کتابوں کے صفحے اُسے بے جان لگتے۔ وہ ہر وقت سوچتی، ''اگر ماں یہاں ہوتی تو سب کچھ کتنا مختلف ہوتا۔''

وقت گزرتا گیا، مگر غم کم نہ ہوا۔ عائشہ کی دوستیں اُسے ہنسانے کی کوشش کرتیں، لیکن اُس کے چہرے پر مسکراہٹ آتے ہی غائب ہو جاتی، جیسے اُس کے دل کی تاریکی اُسے نگل لیتی ہو۔ وہ اپنے والد کو دیکھتی تو اُن کی آنکھوں میں ماں کی یادوں کا عکس واضح نظر آتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتی، ''کیا ہم دونوں کبھی اس غم سے نکل پائیں گے؟''

ایک دن، جب آسمان پر وہی بادل چھائے ہوئے تھے، عائشہ نے ماں کی ڈائری اٹھائی جو اُس نے آخری وقت میں لکھی تھی۔ اُس کے صفحات پر سادہ الفاظ میں محبت اور حوصلے کے پیغام تھے۔ ایک جگہ لکھا تھا:

''عائشہ، زندگی میں غم ہمیشہ ساتھ رہے گا، مگر خوشیوں کو تلاش کرنا تمہارا کام ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم میری یاد میں اداس ہونے کے بجائے اُن خوابوں کو پورا کرو جو ہم نے مل کر دیکھے تھے۔''

اُس رات عائشہ نے پہلی بار اپنی ماں کی بات کو دل سے سمجھا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی زندگی کو بوجھ کے طور پر نہیں، بلکہ ماں کی یاد میں ایک مقصد کے ساتھ گزارے گی۔ اُس نے اپنی پڑھائی میں محنت شروع کی اور اپنے خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کی کوشش کی۔

غم ہمیشہ اُس کے دل کے ایک کونے میں رہا، لیکن اب وہ اُس غم کو اپنی طاقت بنا چکی تھی۔ اُس نے جان لیا تھا کہ زندگی غم اور خوشی کا امتزاج ہے، اور ہر ایک کے حصے میں اپنا اپنا بوجھ ہوتا ہے۔ ماں کی مسکراہٹ اُس کی یادوں میں ہمیشہ زندہ رہی، اور وہ مسکراہٹ اُس کے لیے زندگی کا سب سے بڑا سہارا بن گئی۔

☆☆☆☆☆

ابو شمہ انصاری

دستخط کرنے سے پہلے سوچ لو

دستخط کرنے سے پہلے سوچ لو!
منہ سے نکلی بات، روٹھا یار، بچپن کی حدوں میں
آنکھ سے ٹپکا ہوا معصوم آنسو،
ہاتھ سے پھسلی ہوئی فائل، کبھی لوٹے نہیں!

سر پہ سورج، زیرِ پا ریگِ سیہ تقدیر کی تپتی چمک
قیمتی کاروں کے تلوے چاٹتی ہموار قالینی سڑک
دیکھ اے ٹکسال سے نکلے ہوئے سکے کی چمکیلی کھنک!
کان آنکھوں کی طرح حیران ہیں
کھڑکیاں خاموش، دہرے راستے سنسان ہیں

دن کے ڈھائی بج گئے
ایک زناٹے کا سناٹا ہوا
تن بدن میں سوئیاں چبھنے لگیں
ایک نامعلوم اندیشہ رگ و پے میں سرایت کر گیا
کیا خبر، اگلی کھڑی کیا حکم ہو
کیا عجب، صاحب کوئی فائل منگا لیں اور کچھ رکنا پڑے
دن، دہکتا کھولتا دن، دفتروں کے در پہ آ کر رک گیا
ایسا لگتا تھا، اس آبادی کی بربادی ہوئے، مدت ہوئی

پھر نہ جانے کیا ہوا
ایک ہلکم مچ گئی
تن بدن میں سنسنی سی بھر گئی
دفتروں کے بند دروازے کھلے
پا گرفتہ پیڑ کی چھاؤں میں لو چلنے لگی

فائلوں کا پیٹ بھرنا کس قدر دشوار ہے

سرد خانوں میں سنبھالو، زندہ لاشوں کی پرانی، کرم خوردہ فائلیں
یہ ہمارا رزق ہیں، یہ فائلیں گل سڑ گئیں تو
زندہ لاشیں دفن کر دی جائیں گی

یہ ہمارا رزق ہیں
زندہ لاشیں دفتروں کی کھڑکیوں پر دستکیں دینے کو
گھر سے چل پڑی ہوں گی، چلو دفتر چلیں

دن نکل آیا چلو دفتر چلیں
سر کا سودا، دیگچی کے دودھ کے مانند ہے
سر پہ سورج رکھ کے پھرنا، دیگچی چولہے پہ دھرنا
اور اپنی دھن میں سب کچھ بھول جانا، ایک جیسے ظلم ہیں

گرمیٔ بازار تن پگھلا نہ دے
گرم لُو سے جسم
کانسی کے اکہے سینگ گھوڑوں کی طرح تپنے لگے
قیمتیں پارے کی صورت چڑھ گئیں
پارہ چڑھتی قیمتوں کا ساتھ کب دے پائے گا
کپکپاتا، ہانپتا اک آنچ میں، اک آن میں اڑ جائے گا!
سر جھلس کر رہ گیا
دن اُبل کر بہہ گیا
دن! دہکتا کھولتا دن، دفتروں کے در پہ آ کر رک گیا
دستخط کرنے سے پہلے سوچ لو!
منہ سے نکلی باتیں، روٹھے یار، بچپن کی حدوں میں
آنکھ سے ٹپکے ہوئے معصوم آنسو
زندہ لاشوں کی پرانی، کرم خوردہ فائلیں
آج تک کوئی کبھی لوٹا نہیں!

خالد احمد

حروف ناصح

سید ریاض حسین زیدی

بات سچی جو منہ پہ آجائے
اس پہ ناگفتنی بھی شرمائے
ہوش کو بے وفا نہ ہونے دیں
تمکنت پہ نہ کوئی حرف آئے
غم دنیا سے دوستی کر لیں
ذات کا زخم بھی نہ مرجھائے
فائق ہے اقربا کی دلجوئی
بے اماں غیر بھی نہ ہو جائے
اپنی شہرت کو مشتہر نہ کریں
دوسروں کو یہ حق دیا جائے
رزق پائے حلال کا رشتہ
کھائے منہ کی حرام جو آئے
برگ سرسبز کی عطائیں ہیں
غیر مشروط دیتا ہے سائے
خوبصورت ہو نین نقشہ بھی
خوش ضمیری بہار لے آئے
چلتے رستوں کو خوب چلنے دیں
بے جا بندش نہ راستہ کھائے
ہے ریاضت کی کار فرمائی
اس پہ کیوں نہ ریاض اترائے

نظم

کھڑا ہوا ہوں زمین پر روشنی بچھائے
قریب ہی دھند کے کنارے
بہت سے سائے کھڑے ہوئے ہیں
دلوں پہ حزن والم کے پتھر پڑے ہوئے ہیں
اور اپنے پیروں کے سیسے پر
مضطرب لاشۂ جان وتن اٹھائے
کھڑا ہوا ہوں
زمین پر روشنی بچھائے

مگر مرے اور آج کے سانحے کے مابین
ایک گہری خلیج ہے
اک عمیق کھائی ہے
اک خلا ہے
جو مجھ سے پر ہو نہیں سکا ہے
کہیں کہیں ادھ مرے لفظ ہیں
کرچی کرچی
کٹی ہوئی
درد آثار
خون آشام ساعتیں ہیں
لہو کا دریا ہے
صحن مکتب میں بکھری لاشیں ہیں
خوں میں لت پت
کتابیں ہیں، کاپیاں ہیں، بستے ہیں
طاق ودیوار ودر پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
گولیوں کے لاکھوں نشان ہیں
اور خامشی ہے
ابھی وہ منظر نظر سے گزرے نہیں ہیں میری
کہ جن میں معصوم ننھے بچوں کے
چہروں پر گولیاں لگی تھیں
گلے کٹے تھے
چھدے تھے سینے
بدن جلے تھے
ابھی میں محفوظ گھر میں ہوں
بے خطر
سلامت
یہ سوچ کر شرم سے زمیں میں گڑا ہوا ہوں
کھڑا ہوا ہوں
زمین پر روشنی بچھائے
گلاب تھامے
نظر جھکائے

قریب ہی دھند کے کنارے
بہت سے قاتل کھڑے ہوئے ہیں
بہت سے قاتل گذر رہے ہیں

شاہنواز زیدی

قلم کا گیت

منظور ثاقب

میں قلم ہوں میری مٹھی میں جہانِ علم و فن
میں نشانِ جاہ و عظمت میں شکوہ انجمن

جب بڑھیں مہر و وفا کی راہ پر میرے قدم
سازِ الفت چھیڑ دوں میں امن کا لے کر علم
گونجنے لگ جائیں نغموں سے مرے کوہ و دمن
میں نشانِ جاہ و عظمت میں شکوہِ انجمن

رنجشوں کو بخش دوں میں چاہتوں کا اعتبار
غم زدہ لوگوں کو کردوں راحتوں سے ہم کنار
میری قوت کو سمجھتے ہیں سبھی اہلِ سخن
میں نشانِ جاہ و عظمت میں شکوہِ انجمن

مشرق و مغرب میں پھیلے سایہِ نخلِ اماں
ہر طرف تسکین ہو ہر سو بہارِ بے خزاں
چار سو خوشیاں بکھیروں میں چمن اندر چمن
میں نشانِ جاہ و عظمت میں شکوہِ انجمن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر رنج تری عطا تھا خالد
ہر دکھ اک در بے بہا تھا

فلک تعمیر کرنا ہے

زمیں تخلیق کرنی تھی، سو وہ تخلیق بھی کر لی
زمیں بھی وہ-----
کہ جو زرخیز ہے، سرسبز ہے،
سونا اُگلتی ہے-----

مگر اب کیا کروں میں
اس زمیں پر بھی
کسی آسیب نے قبضہ جمایا ہے
جو مجھ کو دربہ در کرنے کے درپے ہے

سو، غالبؔ کی طرح مر کر مجھے رسوا نہیں ہونا
اگر میں غرق دریا بھی ہوا--- تو بھی
مجھے دریا نے کتنی دیر زیرِ آب رکھنا ہے---
فقط سانسوں کے چلنے تک----؟
پھر اس کے بعد میّت کی وہی بے حرمتی
رسوائی تک لے جائے گی مجھ کو

اگر مجھ کو زمیں پر
چار کاندھے،
چار پائے ہی میسر آ گئے تو میں
فلک تعمیر کر لوں گا
مگر پھر سوچتا ہوں میں
وہاں پر بھی کسی لشکر کا قبضہ ہو گیا تو
پھر----؟؟؟؟؟؟؟

رانا سعید دوشی

وہ بھی سال کا پہلا دن تھا

وہ بھی سال کا پہلا دن تھا
جب ہم پہلی بار ملے تھے
سرما کی پہلی بارش میں
تازہ تازہ پھول کھلے تھے
پہلی بار کسی سے مل کر
اس انداز میں دل دھڑکا تھا
پہلی بار کہیں شبنم کے
سینے میں شعلہ بھڑکا تھا
پہلی بار کسی نے ہم کو
ہم سے اتنا دور کیا تھا
پہلی بار کسی نے ہم کو
جھکنے پہ مجبور کیا تھا
پہلی بار کسی نے دل کا
شیشہ چکنا چور کیا تھا
پہلی بار کسی کو ہم نے
رگ رگ میں محسوس کیا تھا
پہلی بار کسی نے ہم کو
چاہت سے مانوس کیا تھا
پہلی بار کسی کی خاطر
ہم نے کیا کیا خواب بنے تھے
پہلی بار زمیں پر ہم نے
انجم اور ماہتاب بنے تھے

پہلی بار کسی کی خاطر
وقت کو ہم نے موڑ دیا تھا
پہلی بار کسی کی خاطر
جینا مرنا چھوڑ دیا تھا
پہلی بار انا سے ہم نے
وعدہ کر کے توڑ دیا تھا
پہلی بار کسی دلبر سے
ایسی ویسی بات ہوئی تھی
پہلی بار کسی چوکھٹ پر
بیٹھے بیٹھے رات ہوئی تھی
پہلا پہر محبت کا تھا
سارا شہر محبت کا تھا
قطرہ قطرہ موتی موتی
پورا بحر محبت کا تھا
شریانوں کے اندر باہر
پھیلا زہر محبت کا تھا
اس دن سے آگے کی باتیں
کتنے دن اور کتنی راتیں
ہم نے ساتھ گزار دیے تھے
تن من دھن نذرانے سارے
اس چوکھٹ پر وار دیے تھے
وقت کے اس گرداب نے آخر

مسعود احمد

لمحوں کے سیلاب نے آخر
برسوں کے اس خواب نے آخر
قسمت اور تقدیر سے مل کر
ہم کو ایسے گھیر لیا ہے
جیون کی ان سب خوشیوں نے
کس طرح منہ پھیر لیا ہے
آج بھی سال کا پہلا دن ہے
سالِ نو کا پہلا دن ہے
سالِ نو کا پہلا دن پھر
وعدوں کی تمہید میں گزرا
زخموں کی تجدید میں گزرا
مبہم سی امید میں گزرا
دن بھر دید شنید میں گزرا
سناٹوں کی بیچ پہ بیٹھے
تنہایوں کے کنج میں ہم نے
اجڑا دل آباد کیا پھر
گزرے کل کو یاد کیا پھر
ویرانوں کو شاد کیا پھر
سب کچھ تیرے بعد کیا پھر
وہ بھی سال کا پہلا دن تھا
جب ہم پہلی بار ملے تھے
سرما کی پہلی بارش میں
تازہ تازہ پھول کھلے تھے

Dummy

اوہیلو
سنو،
اس قدر دیر کرتے رہو گے
تو پھر سوچ لو.....
نوکری جو ملی ہے تمھیں
عارضی ہے

تمھیں ایک وقت معین دیا تھا
کہا تھا؛
کہ چوبیس گھنٹوں میں
بھیجے ہوئے عکس جیسی بناؤ dummy
جو میرے اشاروں پہ بولے
ہنسے، مسکرائے
جو اچھی طرح ناچنا جانتی ہو

سنو،
کال کے بند ہونے سے پہلے اگر
یہ dummy میرے دفتر نہ پہنچی
تو اس ٹھاٹھ باٹھ
اور اس نوکری سے سمجھنا
کہ فارغ ہو
سمجھے.....!!!

صغیر احمد صغیر

اے مرے درد سنبھل..... (گیت)

اے مرے درد سنبھل
دل سے نکل
چل کسی باغ میں چل

یہ تڑپ کیوں ہے مچلتا کیوں ہے
دکھ بھری راہوں پہ چلتا کیوں ہے
دم زرا لے کہ یہ کم ہو ہلچل
اے مرے درد سنبھل
دل سے نکل
چل کسی باغ میں چل
اے مرے درد سنبھل

دل بے چین کو بانہوں میں سنبھال
کچھ دکھا اپنی رفاقت کا کمال
کہیں ہاتھوں سے یہ جائے نہ نکل
اے مرے درد سنبھل
دل سے نکل
چل کسی باغ میں چل
اے مرے درد سنبھل

چھوڑ دل کو اگر محبت ہے
دل مجروح بھی غنیمت ہے
آج موجود ہے نہ ہوگا کل
اے مرے درد سنبھل
دل سے نکل
چل کسی باغ میں چل
اے مرے درد سنبھل

اجمل اعجاز

سالِ نو

احمد جلیل

اب کے بھی یونہی سال گزرا ہے
جیسے غم دے کے پچھلا سال گیا
اُس نے بھی الجھنوں کے جال بنے
امتحانوں میں یہ بھی ڈال گیا
پھول مہکے نہ آرزؤں کے
دے کے یہ بھی نئے ملال گیا
لاکھ چاہا تجھے بھلا ڈالیں
پر نہ دل سے ترا خیال گیا
دیکھئے! سال تو دکھائے کیا
سال رفت تو کرنڈھال گیا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دوستوں کی بھیڑ میں خالد کہاں یاد آئے گا
ذہن سے تیرے بھی اک دن محو ہو جاؤں گا میں

''دسمبر میں کِھلا کنول''

سنا ہے سرد موسم میں
درختوں پر ہری شاخیں، ہرے پتے نہیں رہتے
سنا ہے اِس دسمبر کی خنک راتوں میں
پیڑوں پر نمو سے سبز ہونے تک
خزاں پڑتی ہے رستے میں!!!
سنا ہے ایسے موسم میں
کہیں بھی گُل نہیں کِھلتے

مگر یہ سچ نہیں جاناں!!!
یہاں کچھ پھول ایسے ہیں
جو اُن کے خاص پھولوں میں بہت ہی خاص ہوتے ہیں
جو بس احساس ہوتے ہیں
جو بن موسم کے کِھلتے ہیں
بڑی مشکل سے ملتے ہیں
بہت ناپید ہوتے ہیں
جو دل کے وید ہوتے ہیں

سنو
تم بھی دسمبر کی خنک راتوں میں دنیا کے
کسی انجان سے بَن میں
کِھلا انمول تحفہ ہو
جسے چُھو کر مجھے لگتا ہے پیرس سی
کسی خوشبو بھری بستی میں مہنگے عطر کی بوتل
کسی نے میرے ہاتھوں میں محبت سے
تھما دی ہو
مجھے خوشبو لگا دی ہو
میں پل دو پل تمہیں اپنے گلے کا ہار کر لوں تو
مرے سینے میں برسوں سے
جمی دھڑکن پگھلتی ہے
بکھرتے سانس کی مالا
بڑی مشکل سنبھلتی ہے

سنو!!
اس سرد موسم کو کہے دنیا جو کہتی ہے
مجھے اتنی خبر ہے بس
دسمبر خوبصورت ہے!!

عاطف جاوید عاطف

مزاحیہ نظم ۔۔۔ آپ کا یہ ہفتہ کیسے گزرے گا (تمام برجوں کے لیے)

پیر کی یہ سہ پہر اچانک
تم کو مہنگی پڑ سکتی ہے
ناک شریف پہ کوئی دیوڑی لڑ سکتی ہے
چھیمو، رانو والے رقعے بیوی یکدم پکڑ سکتی ہے
بات سسر تک بڑھ سکتی ہے
نیلے کپڑوں والی بھکارن سے محتاط ہی رہنا
آج اسے کہہ دینا ۔۔ بہنا ۔۔۔
دفتر سے جب واپس گھر کو آنا
رستے بھر میں تم لاحول ہی پڑھتے جانا

منگل کے دن
کوئی شخص ڈبل شہ بن کر
ایک منٹ کے اندر تم کو ٹھگ سکتا ہے
کچھ دانداں کو کیڑا مکوڑا لگ سکتا ہے
انڈا تمھارے منہ کے اندر پھنس سکتا ہے
عین چول سا بندہ تم پر ہنس سکتا ہے

بدھ کو دور کے پنڈ سے کوئی گیسٹ آئے گا
اپنے ساتھ سسر کے علاوہ
نو دس بچے بھی لائے گا
سارا ٹبر دسویں دن کو
شام کا کھانا کھا کر واپس گھر جائے گا
دائیں ہاتھ تمھارا یکدم
دروازے میں آ سکتا ہے
کوا تمھارے گنج کے اوپر اپنی بیٹ گرا سکتا ہے
شک پڑنے پر ہمسائی کا وہمی شوہر
تھانے میں بھی جا سکتا ہے
کوئی ریڈ کرا سکتا ہے
اور پولیس تمھارے دولت خانے پر
بھجوا سکتا ہے

جمعرات کو شام کے ساڑھے چار بجے تک
کوئی تمھاری وڈیو لیک کرے گا
بالکل ٹھیک کرے گا
آڈیو کال بھی منظر عام پہ آ سکتی ہے
مس معصومہ تمھارا سارا بھٹہ ہی بٹھوا سکتی ہے
تم کو شہر کے رنڈوؤں سے پٹوا سکتی ہے
اور تمھارا فون زنانی کولر میں ہی ڈبو سکتی ہے
یا پھر واشنگ مشین کے اندر دھو سکتی ہے
اور پھر اس نقصان کا باعث تم کو کہہ کر
پورے چھ گھنٹے تک زور سے رو سکتی ہے

جمعے کے دن تیز ہوا میں
تاش کی بازی پھر سکتی ہے
گنج سے اڑ کر وگ بھی نیچے گر سکتی ہے
اک حجام سے جمعہ پڑھ کر
دائیں مونچھ پہ سنجیدہ سا جھگڑا ہو جائے گا
استرے والا پاگل تگڑا ہو جائے گا
گتھم گتھا ہو جانے پر
آدھی ناک بھی کٹ سکتی ہے
چائے والی گرم پیالی
آج تمھارے سوٹ پہ خوب الٹ سکتی ہے

چوتھی پسلی سے بیلن ٹکرا سکتا ہے
سر سے خون بھی آ سکتا ہے
دسواں دانت بھی ہل سکتا ہے
رات کے پونے تین بجے کو
کوئی شاعر تم سے آ کر مل سکتا ہے
تم کو یہ نقصان اٹھانا پڑ سکتا ہے
بیگم کے ہمراہ کہیں بھی سیر کو جانا پڑ سکتا ہے
کوئی تمھارے حقے میں تبدیلی کر سکتا ہے
تمباکو کے بجائے اس میں
کوئی پٹاخہ بھر سکتا ہے

ہفتے کی منحوس فضا میں
تم کو اپنی پڑی رہے گی
بیگم پونے سولہ گھنٹے لڑی رہے گی
یہ محترمہ کسی فضول ترین سی ضد پر اڑی رہے گی
گھر کے سارے بھانڈے آج بھی
صاف کرو گے
بیگم کی ہر غلطی پھر بھی معاف کرو گے
پاؤں پڑنے، منت ترلے کرنے ہوں گے
ورنہ گھر میں بیگم جان کے دھرنے ہوں گے

اس اتوار کو بیگم تم پر وار کرے گی
جوتی بیڑا پار کرے گی

اس ہفتے تم بزم سخن سے تھوڑا سا محتاط گزرنا
صدر نشست کے جوتوں سے تقریباً ڈرنا

عزیز فیصل

سنبھال رکھنا.....

سنبھال رکھنا
رواں دسمبر کا لمحہ لمحہ
یہ دُھند میں لپٹی صبحیں،
بارش میں بھیگتی، ملگجی دوپہریں
گہر میں ڈُوبی سنہری شامیں
یہ ژالہ باری کی تُند بوچھاڑ میں نہاتی،
سیاہ راتیں

سنبھال رکھنا
درونِ شب گاہ
ہنستی راتیں
مہکتی سانسیں
چہکتی باتیں
نئے زمانوں کی اوٹ سے،
مسکراتی جاتیں

(پیاری بیٹی اُمِ ہانی کے نام)

سنبھال رکھنا
رواں دسمبر کی ساری خوشیاں
سنہرے سپنے
رُوپہلے جذبے
حریمِ جاں میں سجی تمنائیں،
آرزوئیں،
دعائیں،
آشائیں

محمد انیس انصاری

نظم

نذر عابد

غزل.....

عجیب تیور ہیں
اِس دُلھن کے
نہ جانے
کتنے مہین پردوں میں
خود کو ایسے چھپائے بیٹھی ہے
جیسے اِس کو
کسی سے کوئی غرض نہیں ہے
بہت سلیقے سے اور قرینے سے
اِس کے جلوؤں کے،
خال و خدو ے
لطیف گوشے مہک اُٹھے ہیں
جو اِس کی رمزوں، اشارتوں کے
گواہ بن کر اُبھر رہے ہیں
جو اِس کے عشاق کے دلوں میں
اُتر رہے ہیں
وُہ جانتے ہیں
یہ حُسن تو
حُسنِ بے بدل ہے
وُہ مانتے ہیں
کہ یہ غزل ہے

ماں

ماں محبت کا اک خزانہ ہے
ہر زمانے میں اک زمانہ ہے

اک طرف دنیا اک طرف ماں ہے
اپنی اولاد کی نگہباں ہے

اس کے قدموں کے نیچے جنت ہے
ماں جہاں میں کھلی حقیقت ہے

زیست کے باب کا نکھار ہے ماں
دل کی تسکین اور قرار ہے ماں

مجھ کو لاڈوں سے اس نے پالا ہے
اس کے دم سے یہاں اجالا ہے

ممتا کی ہے روشنی اس میں
نظر آتی ہے زندگی اس میں

ماں اک ایسا عظیم رشتہ ہے
اس کی آغوش میں یہ دنیا ہے

اس کا نعم البدل نہیں ہے کہیں
روشن اس کی نگاہ اس کی جبیں

ماں کی عظمت کو عابدی کا سلام
ماں ہے دنیا میں روشنی کا نام

علی حسین عابدی

خوش آمدید

ایک وہ۔۔۔
ہجرت کا سال
وہ دن
جب مجھے کاٹ دیا گیا تھا
میرے نصیب میں
رسیوں کا نرغہ
انجانے موسموں کی شدت
تپش کی فراوانی آئی

ایک وہ
لمحہ
جو مجھے غیب کی خبریں
حقائق کی سطریں دینے آیا
اور میں
حیرت کے سمندر میں ڈوبتا
دیکھتا، چلا گیا
مجھے وہ پرندے یاد آئے
جو دانے کی طمع میں
طاغوتی جال میں پھنس گئے تھے
وہ تمام ترقیدی
جوار جنٹ پاسپورٹ کی فیس
ایجنٹ کے ہاتھ میں تھما آئے
وہ خوش نصیب لوگ
جو خیریت سے بیرونِ ملک پہنچ گئے

ہم نئے سال کی خوشی میں
دل جلائیں گے
آنسو بہائیں گے
قبرستان میں
اپنی قبر کی نشان دہی کریں گے
شاید ہم
بوسیدہ نظام کے شاہی تلووں سے
گولی کھائیں گے
اگر ایسا نہیں!!
کہاں سے تازگی کے پھول آئیں گے؟

امجد بابر

گونگے سناٹے

کسی نادیدہ عفریت نے شہر میں بسیرا کرلیا ہے
ہر سو خوف کے سائے رقصاں ہیں
گونگے سناٹے بے آواز بین کرتے ہیں تو
در و دیوار کانپ اٹھتے ہیں
لوگ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں لیکن بات کرنے پر پابندی لگا دی گئی ہے
آوازیں چھین کر لبوں پر تالے لگا دیئے ہیں
وحشت کا کھیل جاری ہے
کہیں پڑھا تھا اک بار خون منہ کو لگ جائے تو زباں کو پھر کوئی اور ذائقہ نہیں بھاتا
باتوں کے بھالوں سے پاک دلوں کو چھیدتے زہر آلود لہجے شاید بھوں گئے ہیں کہ کبھی کبھی وقت الٹی چال بھی چلتا ہے
تب پتھر بھاری لگتے ہیں
اور سانس لینا مشکل

بارود کی بو چناروں کی
خوشبو کی جگہ لے چکی ہے

نفرت کا بیج کتنا ہی بار آور کیوں نہ ہو
زندان میں مقید روحیں خون سے محبت کی آبیاری کرتی رہیں گی
پھولوں کے کھلنے کا اپنا موسم ہوتا ہے
مردہ زمین کی کوکھ انکا جنم نہیں روک سکتی
خوابوں کے شجر پہ پھول کھلنے کو ہیں
آغاز سفر ہو جائے تو منزل
اپنی طرف کھینچ ہی لیتی ہے
ہتھیاروں سے آدرش مرتے نہیں
زندہ جاوید ہو جاتے ہیں
گونگے سناٹوں کی گونج تو آسمان تک جاتی ہے

نائلہ راٹھور

جنم دن!

عرصہء ہجر میں آیا ہے جنم دن اُس کا
اور میں ہوں کہ بہت دور پڑا ہوں اُس سے

ہائے پسماندگیء کارِ محبت ہائے
کس طرح نذر کروں تحفہء جاں اُس کے حضور

تیرے پسماندہ کو اک لمحہء اظہار کی خیر
کاش اس وقت کے کیسے (جیب) سے عطاء ہو جاتی

وہ سیہ آنکھیں درختہ سے لپٹی ہوں گی
اور آہٹ کی تمنا سے مچلتے ہوئے کان

اُس کی قندیل کے گرتے ہوئے موٹے آنسو
کہہ رہے ہوں گے ہمیں پھونک سے روکا جائے

اُس کے ہونٹوں پہ تبسم تو نہیں ہے امشب
اور گلو خشک ہے گالوں پہ نمی ہے شاید

اُس کی دنیا میں ہمیشہ کی طرح آج کی رات
مجھ سے ہجرت زدہ شاعر کی کمی ہے شاید

میری دوشیزۂ نوخیز مبارک ہو تجھے
17 ویں سال کی اِس پہلی شبِ ہجر کا ہار

میں نے دینی تھی اُسے عمر درازی کی دعا
وہ محبت کے اسیروں میں کھڑی تھی آصف

اجنبی شہر کی بوسیدگی کہتی ہے مجھے
ایسی رخصت سے ہزیمت ہی بھلی تھی آصف

آصف محمود

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سورج اُبھرے تو زمیں پر سے اُٹھائے سائے
روشنی آئے مگر ساتھ نہ لائے سائے

بیاض دل

ہر روز دل آباد سے آتی ہیں صدائیں
اور ذہن کے پردے پہ ابھرتے ہیں سوالات
کیوں بند ہیں گلیوں کے دلآویز دریچے
کیوں چاند کی کرنوں نے لکھا درد کا نغمہ
کیوں صبح کی کرنیں بنیں اوراق پریشاں
کیوں شام کے منظر نے کسی کو نہ پکارا

کیوں پھول کو خوشبو نے پلٹ کر نہیں دیکھا
کیوں آج کے منظر میں محبت نہیں ملتی
کیا دشت میں آباد ہے مجنوں کی کہانی
کیا آج ہے فرہاد کو شیریں کی ضرورت؟
لیلائے محبت تو جہاں پہ تھی وہی ہے
بس دل ہے فقط جس کو نہیں ذوق محبت
دیکھو تو زمانے کی ادائیں نہیں بدلیں
اک دل ہے دھڑکنے کی ادا جس کو نہیں یاد
اب چاند بھی محروم ہے شاعر کی نوا سے
تصویر میں بھی رنگ کے آثار نہیں ہیں
نغمات کا جادو بھی تو دل پہ نہیں چلتا
اور ساز بھی خالی ہے ترنم کے فسوں سے

گو وقت کی رفتار تو پہلے کی طرح ہے
پر رقص کے انداز میں آہنگ نہیں ہے
اے وقت دل آباد کو یہ راز بتا دے

اب بھول چلو حسن و محبت کی کہانی
اب شہر محبت میں رہا کچھ بھی نہیں ہے
کیا یاد کریں عشق کے بیتے ہوئے موسم
اور یاد کے صحرا میں اداسی کے لکھیں گیت
جب شہر محبت میں رہا کچھ بھی نہیں ہے

اسحاق وردگ

دسمبر کی یہ تنہا اور سیاہ راتیں

خالق آرزو

دسمبر کی یہ تنہا اور سیہ راتیں
کبھی جب رت بدلتی ہے
تو گہری خامشی کی سرد بستی میں
عجب منظر اترتے ہیں
ہوا جب تیز چلتی ہے
تو پلکوں کے کناروں پر
کئی رنگیں زمانوں کے
عجب کچھ دیپ جلتے ہیں
تمہیں معلوم ہے جاناں!
خزاں کی سرد شاموں میں
اکیلے ہم!
بہت سے جبر سہتے ہیں
بہت خاموش رہتے ہیں
کبھی جب رت بدلتی ہے
خیال آتا ہے اس دل میں
بہت مجبور ہو تم، دور ہو ہم سے
تمہیں معلوم ہی کیا ہے!
کہ یادوں اور سوچوں کی
یہاں کتنی ہی برساتیں
اکیلے کیسے کٹتی ہیں
دسمبر کی یہ تنہا اور سیہ راتیں!

نظم

شائستہ مضمان

تمہیں جب ساتھ کی ضرورت ہو
یا پھر احساس کی ضرورت ہو
تمہارے پاس کوئی خوشبو سا
اگر وجود نہ مہکتا ہو
تو دل کی وحشتوں کو ہولے سے
تم اس خیال سے جھٹک دینا
کہ آسماں ساتھ ہی تو ہے تیرے
کتاب پھول لفظ خوشبو ہیں
ان کا احساس ساتھ ہے تیرے
یہ جھرنے روح کی آپ بیتی ہے
شجر بھی سنگ ساتھی ہے تیرے
ہوا محو کلام رہتی ہے
ابر بھی ساتھ تیرے روتا ہے
ستارے ساتھ جاگتے ہیں تیرے
زمین غم میں کانپتی ہے تیرے
تجھے بھی ساتھ ان کے رہنا ہے
کہ ساتھ زندگی کی ماتند ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس نے مہرِ کرم چمکایا
پگ پگ دھوپ کا ہُن برسایا

دلدل

بہت دنوں سے میں سوچتی ہوں
یہ جدائیاں جو صدیوں سے میرے گلے کا طوق بن کر
میری زندگی کو جکڑ رہی تھیں
میری سانسیں مسلسل اُکھڑ رہی تھیں
یہ طوق توڑ کے نیکی کمانے والے
میں چاہتی ہوں ایک بار تم کو گلے لگا لوں
میں چاہتی ہوں کہ تم سے مل کے کبھی نہ بچھڑوں
میں جانتی ہوں میں ایک دلدل میں پھنس رہی ہوں
گلے میں اب کے ریشمی طوق پڑ گیا ہے
تمہاری خوشبو سے سانس میری مہک رہی ہے
تمہارا نشہ دھیرے دھیرے میری رگوں میں اُتر رہا ہے
میں جانتی ہوں میں ایک دلدل میں پھنس رہی ہوں
میں جانتی ہوں تم جا چکے ہو
مگر کروں کیا کہ تم نشہ ہو

نادانی

تمھارا وار اتنا ہلکا نہیں
کہ زخم ابھی اور گہرا ہوگا
تمھارے زخمی نے ابھی جان ہارنی ہے
پھر اس لاش نے پوری بستی کو
تعفن میں بدلنا ہے
تمھارا وار تمھاری نادانی نہیں ہے

بشریٰ شیریں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد وہ مجھے ہنسا ہنسا کر
کچھ اور اُداس کر گیا تھا

ضبط

اے مرے مسیحا سُن!

بات صرف اتنی ہے

سوگوار راتوں کے

بے قرار لمحوں میں

آنکھ سے ٹپکتے ہی

دل مرا یہ کہتا ہے

درد کے پہاڑوں پر

اختیار لازم ہے

دور جانے والوں کا

انتظار لازم ہے

طلحہ غفور

انتخاب

- خالد احمد -

کیا دن تھے کہ گلیاں سمٹ آئی تھیں گھروں میں
یہ دھوپ سرِ کوچہ و بازار کہاں تھی

نعمان منظور

خود سے تعزیت [اپنے چھوٹے بھائی سید حسن ریاض رضوی کی یاد میں]

وہ مجھے امّی کی گود سے ملا تھا
حسین چہرے پہ خاکی دنیا میں آنے کی
ناگواری سجی ہوئی تھی
گتھے ہوئے بازوؤں پر قدرتی ڈوریاں بندھی تھیں
سنہری بالوں کی کچھ لٹیں
اس کی پیشانی کو چھو رہی تھیں
وہ آنکھیں موندے سبھی کو حیران کر رہا تھا
نہ رو رہا تھا نہ ہنس رہا تھا
پھر اس نے گال تھپتھپانے پہ آنکھیں کھولیں
تو میں اس کو تکتا، حیران ہوتا صحن میں آیا
صحن میں پھرتے مرے کبوتر سنہری مرغی
منڈیر پر بیٹھی آزاد چڑیاں سفید مانو سبھی کھلونے
حسین چہرے سنہری بالوں گتھے ہوئے بازوؤں کی تعریف
کر رہے تھے
میں اپنے آنگن میں بھاگتا پھر رہا تھا
انہی بھاگتے ڈورتے کچھ دنوں میں
دیکھتے دیکھتے ہم بھی کچھ دور ہو گئے تھے
جیب میں سجی ہوئی محبت،
ذہن میں اک دوسرے کو سنبھلنے کے حقیقی خواہش
انہی کالی سڑکوں پہ پندرہ سولہ یا اس سے زیادہ کلومیٹر میں بکھر گئی تھی
وہ جب بھی ملتا، میں اس کو چھوتا گلے لگاتا
پہاڑ جیسے دنوں کی سفاک مصروفیت کو
برق رفتار بھاگتے دنوں کو، ہم دونوں بھائی

ہنسی ہنسی میں شدید گالیاں سناتے
پھر ایک دوجے کو پیار کرتے گلے لگاتے
بہت ہی آساں آساں وعدے کرتے
فلک کو تکتے، زمیں کو ٹھوکر سے کچھ گھماتے
عجیب دائرے بناتے، اپنے اپنے دفتروں میں جا نکلتے
ہمارے دونوں کے درمیان اک بھاگتی دوڑتی سڑک تھی
میں چوتھی منزل کی ایک کھڑکی سے اس کی بلڈنگ کو دیکھتا
تو مجھے پوری بلڈنگ ہی اس کی صورت میں دیکھتی
میں دیکھتا تھا، وہ سامنے، حسن چائے پی رہا ہے
کبھی کبھی ہم بلا ارادہ یونہی گھومتے گھماتے دوپہر میں کھانا بھی ساتھ کھاتے
ہمارے کھانے میں یادیں ہوتیں، روٹی سالن سے ہٹ کر
سلاد کی طشتری میں پرانے قصوں کی قاشیں ہوتیں
پرانے گھر کو حویلی کہتے، نئے علاقوں نئے گھروں کو اسلام پورہ..... پہ وار دیتے،
کبھی اپنے ابا کے مرقد پہ جا نکلتے
بہت ہی روتے، مگر یہ رونا.....
خود اپنے مرنے پہ جیسے رونا عجب لگا ہے
میں اپنے بھائی کی موت پر مطمئن ہوں کہ موت برحق ہے اور اٹل ہے
مگر یہ یادوں کی اُونچی لہروں میں جھلملاتا حسین چہرہ ذرا ہٹے تو
سکون پاؤں
نحیف تن کو بھی جوڑ پاؤں میں اپنے بھائی کی یہ جدائی کسے سناؤں
کیسے بتاؤں
کیسے بتاؤں
کہ سب کی یادوں میں جھلملاتا حسین چہرہ
دمک رہا ہے۔ وہ آنکھیں موندے سبھی کو حیران کر رہا ہے
وہ ہنس رہا ہے، نہ رو رہا ہے

اعجاز رضوی

شہابِ فکر
رانا محمد شاہد

شہرِ وجدان
مظہر امام

ہینڈ میڈ نظمیں

اُجالے اپنی یادوں کے
(یادداشتیں)

2025
سالِ نو مبارک